دیوانِ حالی

الطاف حسین حالی







ہماری شاہکار کتب

الاسماء الحسنٰے	ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی	۱۲۰/=
کلیاتِ اعظم	اعظم چشتی	۲۵۰/=
کلیاتِ ظہوری	محمد علی ظہوری	زیرِ طبع
رزقِ شاہ (ایوارڈ یافتہ)	ریاض حسین چودھری	۱۳۰/=
محمد ﷺ محمد ﷺ	زاہد فخری	۱۰۰/=
جہانِ دانش	احسان دانش	۳۰۰/=
جہانِ دگر	احسان دانش	۳۵۰=
زنجیر بہاراں	احسان دانش	۱۲۰/=
صندل	قتیل شفائی	۱۵۰/=
تنہا تنہا گزری ہے	مظفر وارثی	۱۵۰/=
گئے دنوں کا سراغ	مظفر وارثی	۱۵۰/=
دیوارِ چین کے اس پار	سید ارشاد احمد عارف	۱۲۰/=
جزیرے جمال کے	شوکت علی شاہ	۲۵۰/=
اجنبی اپنے دیس میں	شوکت علی شاہ	۱۵۰/=
سلگتے ساحل	شوکت علی شاہ	۲۵۰/=
خواب سہانے یاد آتے ہیں	حسن رضوی	۱۵۰/=
پیارے	حسن رضوی	۱۳۰/=
سبز رتوں کی جھلمل میں	سعد اللہ شاہ	۴۰۰/=
مجھے بادل اٹھا لائے	سعد اللہ شاہ	۴۰۰/=
ابھی تک آنکھ ہے پُرنم	سعد اللہ شاہ	۴۰۰/=
بادل چاند ہوا اور میں	سعد اللہ شاہ	۱۵۰/=
تمہی ملتے تو اچھا تھا	سعد اللہ شاہ	۱۵۰/=
دھوپ کا چاند (نثری مجموعہ)	سعد اللہ شاہ	۱۵۰/=
اشکوں سے بھری آنکھیں	محمد احمد صابر	۱۸۰/=
آتش پرست (ناول)	محمد اسلم راہی	۲۵۰/=
بابل نینوا (ناول)	محمد اسلم راہی	۲۵۰/=

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ



دیوان حالی

ملنے کے پتے

مکتبہ رحمانیہ، اقرا سنٹر، اردو بازار لاہور

سعد پبلیکیشنز، فرسٹ فلور میاں مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

کوالٹی ڈیپارٹمنٹل سٹور، کالج روڈ، بورے والا

کشمیر بک ڈپو، تلہ گنگ روڈ، چکوال

بنگش بک ڈپو اردو بازار، سیالکوٹ

مسلم بک لینڈ، بینک روڈ، مظفر آباد

مکتبہ رشیدیہ، نیو جنرل، چکوال

ضیاء القرآن پبلشرز، اردو بازار، کراچی

ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی

وہاڑی کتاب گھر - مین بازار وہاڑی

یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار پشاور

رحمان بک ہاؤس، اردو بازار، کراچی

بک سنٹر علامہ اقبال چوک، سیالکوٹ

الکریم نیوز ایجنسی گول چوک، اوکاڑہ

منیر برادرز، مین بازار، جہلم

شائلہ لائبریری، محلہ چوہدری پارک، ٹوبہ ٹیک سنگھ

اسلامی کتب خانہ، فضل الٰہی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

مکتبہ العلم، ۱۷- اردو بازار لاہور

چوہدری بک ڈپو، مین بازار، دینہ

میاں ندیم، مین بازار، جہلم

اسلامک بک سنٹر، اردو بازار، کراچی

دارالادب، تلمبہ روڈ، میاں چنوں

ضیاء القرآن پبلشرز، گنج بخش روڈ، لاہور

اشرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک، راولپنڈی

فرید پبلشرز، نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

شمع بک ایجنسی، فیصل آباد

کتاب گھر، علامہ اقبال روڈ، راولپنڈی

ہاشمی برادرز، مشن چوک، کوئٹہ

نیو الیاس کتاب محل کچہری بازار، جڑانوالہ

ڈائمنڈ بک ڈپو، چینک روڈ، مظفر آباد آزاد کشمیر

بختیار سنز، قصہ خوانی بازار، پشاور

ادریس کتاب محل، مین بازار، منڈی سمبڑیال

دیوان حالی



مولانا الطاف حسین حالی



خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اردو بازار - لاہور ۷۳۱۴۱۶۹

تزئین و اہتمام
نذیر محمد طاہر نذیر



سال اشاعت	۲۰۰۱ء
سرورق	عبیداللہ
اہتمام	محمد نذیر طاہر نذیر
کمپوزنگ	الاشراق کمپوزنگ سنٹر' لاہور
مطبع	زاہد بشیر پرنٹرز' لاہور
قیمت	200 روپے

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

کچھ کذب وافترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا تعشق کو لازم وملزوم سمجھتے تھے۔ اور ایسا سمجھنا کچھ بے وجہ نہ تھا اول تو خود شعر کا حدوث ہی دنیا میں اس جوش اور ولولہ سے ہوا ہے۔ جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور شعر کی ذات میں جو ایک آتشگیر مادہ ہے وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعالک کا محتاج ہے۔ پھر قوم[1] کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا اسی خیال کی تائید کرتا تھا۔ باایں ہمہ حداثت سن یہ کب اجازت دیتی تھی کہ شاہد رعنائے سخن کا نظارہ ایک پیر زال کی صورت میں کیا جائے اور شراب ارغوانی کی جگہ سرکہ بے نمک سے ضیافت طبع کی جائے۔ غرضیکہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا۔ بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی۔ اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب کبھی یہ سودا اچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑ لیے جس پر رہیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلہ کا ساتھ، راہ کی ہمواری، اور رہگذر کی فضا چھوڑ کر دور اور ستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا۔ وہ تمام سیمیائی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دلفریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل وتشبیب کی امنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی۔ اور جس شاعری پہ ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔

۱۔ قوم سے یہاں اس کے متعارف معنی مراد نہیں ہیں بلکہ یہاں قوم سے مراد شعراء ہیں۔

"یقولون[1] هل قبل الثلثین ملعب　　فقلت و هل بعد الثلثین ملعب"

جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں مونہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے۔ مگر زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفرین سننے سے دلشکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے۔ اور حاکمِ وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے۔ کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں۔

یکرہ بحال خویش ہم آخر تواں گریست　　تا چند برفلان و بہ بہماں گریستن

کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں۔ بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند۔ مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بیتی۔ اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی۔ جو نظمیں کسی قدر طولانی تھیں وہ تقریباً تمام چھپ چکی اور شائع ہو چکی ہیں۔ اب زیادہ تر کچھ بچے کھچے متفرق اور پراگندہ خیالات باقی ہیں۔ جن میں سے کسی قدر قطعہ و رباعی کے لباس میں اور کچھ غزل کے روپ میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ ان کے سوا چند ترکیب بند۔ اک آدہ مسمط۔ کچھ قصیدے اور کچھ تاریخیں ہیں۔ جن میں سے اکثر خاص خاص طور پر وقتاً بعد وقت شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن مصنف کی طرف سے عام طور پر پبلک کی نذر نہیں ہوئیں۔ پہلا کلام جو عالم جہل و نادانی یا خلاصۂ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسی قدر تلف ہو جانے کے بعد جس قدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے۔ انسان کی طبیعت کا مقتضی ہے کہ جو کام اس کی تھوڑی یا بہت کوشش سے سرانجام ہوتا ہے عام اس سے کہ اچھا ہو یا برا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو وہ اسکو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے جس فخر کے ساتھ کہ وہ اعرابی[2]

۱۔ یعنی لوگ کہتے ہیں کہ کیا لہو و لعب کا زمانہ تیس برس سے پہلے ہے' سو میں نے ان سے کہا کیا لہو و لعب کا زمانہ تیس برس کے بعد ہے؟

۲۔ یہ ایک مشہور حکایت کی طرف اشارہ ہے یعنی ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک بدوی جس نے کبھی دجلہ کے شیریں پانی کا مزا نہ چکھا تھا' اس کو صحرا میں ایک چشمہ ملا جس کا پانی اگرچہ دجلہ کے پانی سے کچھ نسبت نہ رکھتا تھا لیکن جیسا شور پانی کہ وہ بدوں ہمیشہ پیا کرتا تھا' اس سے کسی قدر میٹھا تھا۔ وہ خوشی خوشی اس کی ایک مشک بھر کر بغداد میں پہنچا اور خلیفہ کے دربار میں اس کو بطور ایک عِلقِ نفیس کے پیش کیا۔ خلیفہ نے اس کو چکھا تو بالکل کھاری پانی تھا مگر اس کی بدمزگی بدوی پر ظاہر نہیں ہونے دی اور اس کو انعام دے کر رخصت کیا اور حکم دے دیا کہ یہ شخص دجلہ کا پانی نہ پینے پائے ورنہ اپنے دل میں شرمندہ ہوگا۔

جس نے کبھی آب شیریں کا مزہ نہ چکھا تھا ایک کھاری پانی کے چشمہ سے مشک بھر کر ہارون رشید کے دربار میں بطور سوغات کے لے گیا تھا۔ وہ اس فخر سے کچھ کم نہ تھا جو کلمبس امریکا دریافت کر کے ازبلا کے دربار میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ پس یہ تمام مجموعہ جس میں کچھ نئے اور کچھ پرانے خیالات شامل ہیں محض ایک امید موہوم پر کہ دیکھئے مردود ہو یا مقبول۔ ملک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور پہلے اس سے کہ کوئی ہم پر ہنسے ہم اپنے دعووں پر آپ ہنستے ہیں۔

شاید ناظرین کو پچھلے زمانہ کے خیالات میں پہلے زمانہ کی نسبت حقائق و واقعات کا کچھ زیادہ جلوہ نظر آئے۔ اور جیسی کہ امید کیجاتی ہے ان خیالات کو سچی شاعری کا ایک نمونہ تصور کیا جائے۔ مگر یہ بات کہ جیسے یہ خیالات کانوں کو سچے معلوم ہوتے ہیں ایسے سچے دل سے بھی نکلے ہیں یا نہیں خود ہم کو بھی معلوم نہیں۔ تا بدیگراں چہ رسد۔ جیسا کام محض سچے جوش اور ولولہ سے ہوتا ہے ویسا ہی بلکہ بعض اوقات اس سے بہتر محض شہرت اور ناموری کی خواہش' تحسین و آفرین کے لالچ۔ جلب منفعت کی توقع' یا کم سے کم اپنا دل خوش کرنے کے خیال سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور خود کرنے والے کو اپنے کام کا منشا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اگرچہ ہم اس وقت نہ ہونگے۔ مگر زمانہ سچ اور جھوٹ کو اور دودھ اور پانی کو الگ کیے بغیر نہ رہے گا۔ سچ پھولے گا اور پھلے گا۔ اور جھوٹ برسات کے سبزہ کی طرح جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔

"وکم[1] قد راینا من فروع کثیرۃ　　　　تموت اذا لم تحیمن اصول"

ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آ جاتا ہے مگر پہیا اور دھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیئے تھے۔ مگر اسلوب بیان میں مطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح' ہجا' غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید' مناجات' اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات کی پیروی سے دست

۱۔ ہم نے وہ شاخیں اکثر سوکھتی دیکھی ہیں جن کی جڑیں اس قابل نہ تھیں کہ اپنی شاخوں کو ہرا بھرا رکھ سکیں۔

بردار ہو جائیں مگر ان کے طریقۂ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک میں روشناس ہونے اور اہلِ ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لیے اسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے۔ اور اپنی وضع، صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل زائل کر دے۔ اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرزِ بیان میں قدما کی طرزِ بیان سے بہت دور نہ جا پڑے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انھیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔ اور قدما کا دل سے شکر گزار ہو جو اس کے لیے ایسے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

کچھ تعجب نہیں کہ اس مجموعہ کو اور نیز ان نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں دیکھ کر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے؟ نہ خیالات ہی ایسے اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں۔ اور نہ طرزِ بیان ہی میں کوئی ایسی جدت ہے جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں اور یہ سمجھ کر وہ بے اختیار پکار اٹھیں کہ "ھذا الذی رزقنا من قبل [۱]" پس ان کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرزِ ادا میں جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا وہ بہت کم فرق پائیں گے۔ مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں۔ یا کسی کے ذہن کی ان تک رسائی نہ ہو سکے۔ بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و ناشاعر کے دل میں ہمیشہ گزرتے ہیں اور ہر وقت ان کے پیشِ نظر ہیں۔ مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور مبتذل ہیں ان کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور ان کی طرف بہت کم التفات کیا گیا۔ اور پایۂ شاعری کو ان سے وراء الوراء سمجھا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقہ شاعری کا بھید انھیں مبتذل خیالات میں چھپا ہوا تھا جو

۱۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اہلِ جنت کو کوئی جنت کا پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے ہذا الذی رزقنا من قبل (یعنی یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا) کیونکہ جنت کے میوے صورت میں یکساں معلوم ہوں گے مگر ہر ایک کا مزا اور لذت جدا ہوگی۔

بسبب غایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا۔

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہے ہرگز یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو عدمِ محض سے وجود میں لا سکے۔ اس کی بڑی دوڑ یہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دے کر اس میں ایک نئی صورت پیدا کر دے۔ پس جس طرح معمار عمارت تیار کرنے میں اینٹ مٹی اور چونہ کا۔ یا بڑھئی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے۔ اسی طرح ضرور ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترغیب دینے میں کسی ایسے مصالح کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامر میں موجود ہو۔ وہ مصالح کیا ہے؟ یہی دنیا کے حالات جو روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں۔ خواہ وہ انسان سے علاقہ رکھتے ہوں۔ یا زمین' آسمان' چاند' سورج' پہاڑ اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے یا مچھر' مکڑی اور بھنگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے۔ پس جس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اور شعر کی بنیاد محض فرضی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی۔ اس کی مثال اس معمار کی سی ہوگی جو عمارت بنانے کے لیے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مصالح کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہو سکتی۔

''ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی   کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست''

الغرض جب سے شاعری کی لے کھلی' معمولی شکار چھوڑ کر عنقا کی گھات میں بیٹھنا اور زمین پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزولِ مائدہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ زمانہ کے حالات دیکھ کر جو کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی۔ ان کو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقہ کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے۔ بعض خیالات بحسب ضرورت اقوال سلف یا حکایات سلف سے اخذ کیے گئے۔ کہیں ان کو اپنے حال پر رہنے دیا اور کہیں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے اس کو ایک نئی صورت میں جلوہ گر کیا گیا۔ بعض قطعات و رباعیات میں اخلاقی مضامین کنایہ میں ادا کیے گئے جو شائد کہیں کہیں مطایبہ کی حد کو پہنچ گئے ہوں مگر انوری، سعدی و

شفائی کے مطالبات کے آگے یقیناً بے نمک معلوم ہوں گے۔ ریا و مکر و سالوس و عجب و خود پسندی اور اسی قسم کے اخلاق واعظ و زاہد و صوفی و شیخ و ملا پر ڈھالے گئے۔ نہ اس لیے کہ نعوذ باللہ اس فرقہ علیہ کی مذمت مقصود تھی۔ بلکہ اس لیے کہ ان اخلاق کے بیان کرنے کا اس سے واضح تر کوئی عنوان نہ تھا۔ سیاہی کا دھبا جیسا اجلے کپڑے پر صاف نمایاں ہوتا ہے ایسا میلے کپڑے پر نہیں ہوتا۔ ظلم اور بے انصافی کے مرتکب اپنی اپنی طاقت کے موافق فقیر اور بادشاہ دونوں ہوتے ہیں۔ مگر جب ظلم کو زیادہ ہولناک صورت میں دکھانا منظور ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ سلطنت کے لباس میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ریا و عجب و خود پسندی اگرچہ ہر فرد بشر میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔ مگر جب اس کو علم و زہد و مشیخت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تعجب انگیز اور ڈرانی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی شاعری کی علت غائی ہے۔

شاعر جب اخلاقی مضامین بیان کرتا ہے تو اس کو بضرورت اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم کو بھی کہیں کہیں ناصح بننا پڑا ہے۔ مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اصلی ناصح خود برائیوں سے پاک ہو کر اوروں کو ان سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ مگر شاعر چونکہ برائیوں کی ہو بہو تصویر کھینچ کر دکھاتا ہے۔ اور گھر کے بھیدی کی طرح چھپے رستموں کے پتر ے کھولتا ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھر کر ظاہر کرتا ہے۔ ہر بدی اور گناہ کا نمونہ کم یا زیادہ، پوشیدہ یا علانیہ انسان کے نفس میں موجود ہے۔ پس اگر بدی یا گناہ کے متعلق کوئی پتے کی بات شاعر کی قلم سے مترشح ہو تو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے ہی نفس کی چوریاں ظاہر کر رہا ہے۔

ہیں عاشقی کی گھاتیں معلوم اس کو ساری
حالی سے بدگمانی بے جا نہیں ہماری

شاید اس موقع پر شاعر کی طرف سے یہ عذر ہو سکے کہ اس میں فطرت انسانی کے دقائق و غوامض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے جس کی مدد سے بعض اوقات ایک رند مشرب اور خراباتی شاعر جس پر پرہیزگاری کی کبھی چھینٹ نہ پڑی ہو وہ پرہیزگاروں کی سوسائٹی کا ایسا صحیح نقشہ کھینچ

دیتا ہے کہ خود اس سوسائٹی کے ممبر بھی اپنی سوسائٹی کا ویسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے۔ اسی طرح ایک دوسرا شاعر جس نے پرہیزگاروں اور پارساؤں کے حلقہ سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا وہ رندو دواوباش کی صحبتوں کا ایسا چربا اتار دیتا ہے کہ گویا انھیں میں سے ایک نے اپنی حالت کی تصویر کھینچی ہے۔ ابونواس نے بارہا خلیفہ سے ایک مصرع سن کر جس میں رات کے تخلیہ اور عیش وعشرت کی صحبت کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوتا تھا۔ اس مصرع کی تضمین میں ایسے واقعات بیان کر دیئے ہیں کہ خلیفہ متعجب ہو کر بے ساختہ یہ کہہ اٹھتا تھا ''قاتلک اللہ کانک کنت ثالثنا[۱]'' شکسپیر جس کے ہمراہی ہرن کا شکار کھیلنے والے اور تماشا کرنیوالے تھے اور جس نے کبھی آنکھ کھول کر عالی خاندان اور شریف و پاکیزہ عورتوں کی سوسائٹی نہ دیکھی تھی اس نے میکبت' جولیٹ' کیتھرائن' ڈزچمونا اور بعض اور لیڈیوں کے ایسے اصلی کیرکٹرز دکھائے ہیں جن کا اس سوسائٹی پر جس میں اس کی عمر گزری تھی کبھی پرچھاواں تک نہ پڑا تھا۔ ایران میں فردوسی اور ہندوستان میں انیس' رزم کے بیان میں صدہا باتیں ایسی ٹھکانے کی لکھ جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات گویا خود ان پر گزر رہے تھے۔

اس عذر سے اگرچہ کسی قدر شاعر کی برأت ہو سکتی ہے۔ مگر پھر بھی اس کو واعظ و ناصح کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ناصح کی غرض براہ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے۔ بخلاف شاعر کے کہ اس کا اصل مقصود فطرت انسانی کی کرید۔ اور واقعات دہر سے متاثر ہو کر دل کی بھڑاس نکالنی ہے اور بس۔ وہ کسی کے سمجھانے کے لیے نہیں چلاتا بلکہ خود کچھ سمجھ کر چیخ اٹھتا ہے۔

ناصح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور مشیر
دردمندان کے نہ ان کے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھکر
نالۂ بے اختیار بلبل نالاں ہیں ہم

پس اگر شاعر کا کوئی قول اس کے فعل کے برخلاف پایا جائے تو اس کو واعظ یا ناصح قرار دیکر

۱۔ خدا تجھ کو شرمائے گویا کہ تیسرا ہم میں تو تھا یعنی تو نے ایسے سچے واقعات پیش کیے ہیں کہ گویا تو بھی ہماری صحبت میں شریک تھا۔

یہ الزام دینا نہیں چاہیے کہ "اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم" بلکہ اس کی طرف سے یہ عذر کرنا چاہیے کہ "انھم یقولون مالا یفعلون"

انسان کے کلام میں کہیں کہیں اختلاف یا تناقض پایا جانا ایک ضروری بات ہے بلکہ اس کے کلام کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ "ولو کان من عند غیر اللہ لوجدو فیہ اختلافا کثیرا" مگر جس طرح ایک فلسفی یا مؤرخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جانا اس تصنیف کو عیب لگاتا ہے اس طرح شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگاتا بلکہ اس کا بیساختہ پن ظاہر کرتا ہے جس کو شاعری کا زیور سمجھنا چاہیے۔ فلسفی یا مؤرخ ہر ایک چیز پر اس کے تمام پہلو دیکھ کر ایک مستقل رائے قائم کرتا ہے۔ اور اس لیے ضرور ہے کہ اس کا بیان جامع و مانع ہو لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ہر ایک شے کا جو پہلو اس کے سامنے آئے۔ اور اس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہو کر اس کے دل کو بے چین کر دے اس کو اسی طرح بیان کرے پھر جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو اسی کو اس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے۔ وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا تا کہ اس کو حقائق وواقعات کے ہر ایک پہلو پر نظر رکھنی پڑے۔ بلکہ جس طرح ایک فوٹو گرافر ایک ہی عمارت کی کبھی رو کار کا۔ کبھی پچھیت کا۔ کبھی اس ضلع کا اور کبھی اس ضلع کا جدا جدا نقشہ اتارتا ہے۔ اسی طرح شاعر حقائق وواقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے۔ پس ممکن ہے کہ شاعر ایک ہی چیز کی تعریف کرے اور کبھی مذمت۔ اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بری چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت۔ اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بری چیز کی تعریف۔ کیونکہ خیر محض کے سوا ہر چیز میں شر کا پہلو اور شر محض کے سوا ہر خیر میں خیر کا پہلو موجود ہے۔ عقل' علم' زہد' دولت' عزت اور آبرو عموماً ممدوح ومقبول سمجھی جاتی ہیں۔ مگر شعرا نے ان کی جابجا مذمت کی ہے۔ اسی طرح دیوانگی' نادانی' رندی' فقر' ذلت اور رسوائی عموماً مذموم ومردود گنی جاتی ہیں۔ لیکن شعرا ان کے اکثر مداح رہے ہیں۔

شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے اس

سے نفرت دلاتا ہے۔ وہ کبھی قدما کے مقابلہ میں اس لیے کہ وہ استاد اور موجد فن تھے اپنے تئیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے۔ اور کبھی اس لیے کہ اس نے ان کی دولت میں کسی قدر اپنی کمائی بھی شامل کی ہے جو ان کے پاس نہ تھی اپنے تئیں ان پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ کبھی دنیا کی اس لیے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دارالغرور و دارالمحن ہے۔ اور کبھی اس کی بڑائی و عظمت اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعہ آخرت ہے وہ ایک ہی گورنمنٹ کی کبھی اس کی خوبیوں کے سبب سے ستایش کرتا ہے اور کبھی اس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت' مگر وہ کبھی ان حیثیتوں کی تصریح نہیں کرتا جن پر اس کے مختلف بیانات مبنی ہوتے ہیں۔ جب ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو گویا دوسرے پہلو کو بالکل بھول جاتا ہے۔ وہ ایک نادان بچہ کی طرح کبھی بے اختیار رو پڑتا ہے اور کبھی ہنسنے لگتا ہے۔ مگر نہ اس کے رونے کا منشا معلوم ہوتا ہے نہ ہنسنے کا۔ پس ممکن ہے کہ شاعر کے کلام میں ایسی بے جوڑ باتیں دیکھ کر لوگ متعجب ہوں۔ مگر جب تک شاعر کا سا دل ان کے پہلو میں اور ویسا ہی سودا ان کے دماغ میں نہ ہو ان کا تعجب رفع ہونا مشکل ہے۔

"بہ زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را نواگران نخوردہ گزند راچہ خبر"

یہ چند اصول جو اوپر بیان کیے گئے ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نکتہ چینیوں کی زبان بند کرنی مقصود ہے۔ کیونکہ جس طرح فوارہ روکنے سے زیادہ زور کے ساتھ اچھلتا ہے۔ اسی طرح نکتہ چینوں کی زبان' بند کرنے سے اور زیادہ کھلتی ہے۔ دوسرے نکتہ چینیوں سے کان اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ جس طرح توپ خانہ کا گھوڑا توپ کی آواز سے کبھی کان نہیں ہلاتا۔ اسی طرح مصنف نکتہ چینیوں کے شور وغل کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ پس ان کی زبان بند کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت۔ البتہ ضرورت وقت اس امر کی مقتضی تھی کہ دیباچہ میں یہ چند باتیں جتا دی جائیں ظاہر ہے کہ سویلیزیشن جس کو شعر و شاعری کا قاتل کہا جاتا ہے اس کا پرچھاواں اس ملک پر بھی پڑنے لگا ہے۔ شعر جس کو مدرسہ میں لے جانے کی اجازت نہ تھی[1] اس کو روز بروز زیادہ تر مدرسہ ہی کے ساتھ پالا پڑتا جاتا ہے۔ تعلیم ایسے عقل و دانش کے پتلے جوق جوق اور فوج فوج پیدا کر رہی ہے جو شعرا کے نزدیک ذوق معنی سے ایسے ہی بے بہرہ ہیں جیسے شعرا ان کے نزدیک عقل و دانائی سے۔

۱- یہ اشارہ ہے اس مشہور مقولہ کی طرف کہ "شعر مرا بہ مدرسہ برد"

ان پر شعر اتنا بھی اثر نہیں کرتا جتنا کہ عرب کے اونٹ پر حُدی خواں کی آواز اثر کرتی ہے۔ غرضکہ شاعرانہ مذاق یوماً فیوماً ملک سے مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اور ایسی علامتیں موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چراغ بہت جلد ہمیشہ کے لیے گل ہونے والا ہے۔ نہ پرانی شاعری باقی رہتی نظر آتی ہے اور نہ نئی شاعری آگے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں دیوان شائع کرنا اور شاعری کے متعلق کچھ اصول بیان نہ کرنا ایسی بات تھی جیسے چین میں عبرانی بائبل شائع کرنی۔ اسی لیے مقدمہ میں مطلق شاعری پر کسی قدر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اور چند باتیں جو خاص اس مجموعہ سے علاقہ رکھتی تھیں وہ اب دیباچہ میں بیان کی گئیں۔ لیکن اگر غور کیجیے تو ان میں سے کوئی چیز بھی ضروری نہ تھی۔ مقدمہ اور دیباچہ لکھنا تو درکنار۔ سرے سے شعر کہنے ہی کی کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

''آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست''

مگر مدبر السموات والارض نے اس خرابہ آباد دُنیا کی رونق اور بہار ہماری اسی غفلت و نادانی پر موقوف رکھی ہے کہ دن رات یہاں کے گورکھ دھندوں میں الجھے رہیں۔ دھوکے کو حقیقت اور خواب کو بیداری سمجھیں۔ اور جس کوشش و جانفشانی کے ساتھ کہ مکڑی عمر بھر اپنے بودے اور کمزور جالے کے پورنے میں سرگرم رہتی ہے اسی کوشش و جانفشانی کے ساتھ ہم بھی اپنی بے بنیاد اور بادر ہوا عمارتیں چنتے رہیں یہاں تک کہ فنا ہو جائیں۔

''درکارخانہ کہ بنائش بہ غفلت ست ہشیار زیستن نہ ز قانون حکمت ست''

''نروح ونغدو لحاجاتنا وحاجة من عاش لاتقضي
ويسلبه الموت اثوابه ويمنعه الموت ما يشتهي
تموت مع المرء حاجاته وتبقى له حاجة ما بقي''

ترجمہ: ہم اپنے کاموں میں صبح شام سرگرم ہیں۔ اور جو شخص زندہ ہے اس کا کام ختم نہیں ہو سکتا۔ موت ہی اس کے کپڑے اتروائے گی اور موت ہی اس کی خواہشوں کا خاتمہ کرے گی۔ انسان کی خواہشیں اس کے ساتھ ہی مریں گی جب تک وہ زندہ ہے کوئی نہ کوئی خواہش اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔

الطاف حسین حالی

چھوٹوں کا بڑا بن جانا

چند خطوط اک دانا نے ـــ کھینچ کے یاروں سے یہ کہا
دیکھ لو ان میں جتنے ہیں خط ـــ کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
ہے کوئی؟ جو ہاتھ لگائے ـــ دے یونہی چھوٹے خط کو بڑھا
ایک نے جتنے خط تھے بڑے ـــ اٹھ کے دیا ایک اک کو مٹا
جب نہ رہا واں پیش نظر ـــ خط کوئی چھوٹے خط کے سوا
دیکھا اٹھا کر آنکھ جدھر ـــ تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا
کل کی ہے یارو بات کہ تھی ـــ قوم میں باقی جان ذرا
قوم میں جیسا حال ہے اب ـــ آدمیوں کا کال نہ تھا
تھے موجود ادیبوں میں ـــ اَخطل و اَعشیٰ کے ہمتا
منشیوں میں ایسے تھے بہت ـــ جن پہ کہ نازاں تھی انشا

شعر میں تھے استاد اکثر　　سحر بیاں اور نکتہ سرا
لے گئی ان کو آخر کار　　بحرِ فنا کی موج بہا
اہلِ ہنر کا نام و نشاں　　قوم میں جب باقی نہ رہا
حالی و زید و عمر بنے　　صاحبِ دیواں نامِ خدا
اب چاہو استاد گنو　　یا ہمیں سمجھو تم یکتا
ہم ہیں وہی ناچیز مگر
کَبَّرَنَا مَوْتُ الْکُبَرَا

شعر کی طرف خطاب

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تو' تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو
آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو
تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری
قبلہ ہو اب ادھر تو نہ. کیجو نماز تو
اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز
جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ ساز باز تو

ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ
معذور جان ان کو جو ہے چارہ ساز تو

چپ چاپ اپنے سچ سے کیے جا دلوں میں گھر
اونچا ابھی نہ کر عَلَمِ امتیاز تو

جو نابلد ہیں ان کو بتا چور بن کے راہ
گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو

عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو

اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل
بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بے قدریوں کے بعد
اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

جو قدرداں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو

مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریحانِ جوانی کی بہار آخر حیف
طبعِ رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ
سر ہے سودا سے تہی، عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھیے غزل میں آخر
نہ رہی چیز وہ مضمون سوجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی

ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیے وصلِ صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجیے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
تا کہ بھڑکائے جوانوں کے دلِ آتش کی طرح
وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
"قحبہ چوں پیر شوَد پیشہ کُنَد دلّالی"

نکتہ چینی

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم وفضل میں
جس طرح بن آئے بیٹا نام پیدا کیجیے
کیجیے تصنیف اور تالیف میں سعیِ بلیغ
اس میں ایک اپنا پسینا اور لہو کر دیجیے
دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا
اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجیے
اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں
شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

بے تمیزیِ ابنائے زمان

از رہِ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا
ہے وجود اے مبتذل تیرا برابر اور عدم
جنس تیری کسمپرس اور قدر و قیمت تیری ہیچ
تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونے کا غم
دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا
امتحاں کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم
مسکرا کر آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا
گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز
ہیں مبصر ایسے اس بازارِ ناپرساں میں کم
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں
تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑ رہتے ہیں ہم

ایک خود پسند امیر زادہ کی تضحیک

کہتے ہیں اک امیر زادہ کو
تھا خدنگ افگنی کا شوق کہیں
خصلتیں جو امیر زادوں میں
لازمی ہیں وہ اس میں بھی سب تھیں
گو کہ رکھتا نہ تھا ہنر کوئی
آپ تھا خود پسند اور خود بیں
کچھ نہ تھا پر سمجھتا تھا سب کچھ
علم تیر و کماں میں اپنے تئیں
واہ وا سنتے سنتے یاروں کی
ہو گیا تھا ہنر کا اپنے یقیں

الغرض ایک روز صحرا میں
جب کہ تھے ساتھ سب جلیس وقریں
مشقِ تیر افگنی میں تھا مصروف
کر رہے تھے خوشامدی تحسیں
آ کے دیکھا جو اک ظریف نے حال
وجہِ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں
تیر جتنے کمان سے چھوٹے
پائے سب نے اصول دب آئیں
جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا
تیر آماجگہ کے کوئی قریں
ایک جاتا تھا چھُٹ کے سوئے شمال
ایک جاتا تھا پھٹ کے سوئے یمیں
کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی
رکھ کے بالائے طاق سب تمکیں
خاک تو دے پہ جا کے ہو بیٹھا
لوگ کرتے رہے چناں و چنیں

ناوک انداز بولا چلا کر
کوئی تجھ کو جنوں ہے اے مسکیں
یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے
یا کہ دوبھر ہے تجھ کو جانِ حزیں
عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا
جبکہ جائے گریز ہو نہ کہیں
زد سے ان بے پناہ تیروں کی
کہیں جاں دار کو امان نہیں
مجھ کو ہر پھر کے شش جہت میں حضور
امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

پولٹیکل سپیچیں

اے بزمِ سفیرانِ دُوَل کے سخن آرا
ہر خورد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن
کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہے
ظاہر ہے نہ غصہ میں بیاں سے تری رنجش
نہ لطف میں کچھ طرز بیاں اس سے جدا ہے
ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار
اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے
جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سے شیریں
اور جنگ میں کچھ لطفِ سخن اس سے سوا ہے

گر سوچیے تو سیکڑوں پہلو ہیں مفر کے
اور سنیے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہے

دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات
گونگا نہیں گویا نہیں کیا جانئے کیا ہے

کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں سے
اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

تھے لب پئے اظہار پہ اب آ کے کھلا یہ
انساں کو اِخفا کے لیے نُطق ملا ہے

بدی کر کے نیک نامی کی توقع رکھنی

نامنصف و بے رحم تھا اک ضلع کا حاکم
برتاؤ سے نالاں تھی بہت جس کی رعیت
جب دورہ کو اٹھتا تھا تو دیہات میں جا کر
تھا پوچھتا ایک ایک سے ازراہِ شرارت
ہیں پرگنہ کے لوگ سمجھتے ہمیں کیسا
کرتے ہیں ہماری وہ ستائش کہ مذمت
تھی اس کی مثال ایسی کہ اک شخص بدآواز
جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنی کراہت
گاتا تھا کھڑا ہو کے اور آواز کے پیچھے
ہر بار لپکتا تھا بصد تیزی و سرعت
ہو تا کہ یہ معلوم کہ ہے دور سے میری
آوازِ خوش آئند وَ یا قابلِ نفرت

تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زاہد نے کہا "زینت و اسباب پہ جو لوگ
اتراتے ہیں اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے"
حالی نے کہا "جن کو ہے اترانے سے نفرت
اترا کے وہ اس طرح نہیں ناک چڑھاتے"

سید احمد خاں کی تکفیر

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں
بعض کے نزدیک توحید اس کی حَدِ تام ہے
ہے مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود قول
جو ہیں قائل اس کے ان پر کفر کا الزام ہے
کیونکہ اس سے ماننا پڑتا ہے اس رحمت کو عام
جس سے غیر از اہلِ قبلہ جو ہے وہ ناکام ہے
بعض کہتے ہیں کہ "شر سے تیرے سب ایمن رہیں
بس مسلمانی و دیں داری اسی کا نام ہے
پر یہ حد بھی جامع و مانع نہیں عندالعقول
کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اسے وہ خام ہے

ایمنی کا مستحق ہے خاص کر اپنا گروہ
اور سب کا لفظ یار اغیار سب کو عام ہے

بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہے لباس
جو لباسِ غیر پہنے خارج از اسلام ہے

بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ
حصر کرنا ان تمام آرا کو مشکل کام ہے

مذہبِ منصور ہے لیکن بیاں کرنا ضرور
جو مسلّم آج کل نزدیکِ خاص و عام ہے

اہلِ حَل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر
سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

قرض لے کر حج کو جانے کی ضرورت

قریبِ موسمِ حج، قرض لے کے اک دیں دار
چلا بہ نیتِ حج، گھر سے سوئے بیت اللہ
کہا یہ اس سے اک آزاد نے کہ اے حضرت
کیا ہے آپ پہ شارع نے جبر یا اکراہ
کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوئے حجاز
وطن میں چھوڑ کے اطفال کو بحالِ تباہ
نہ نان و نفقۂ فرزند و زن سے خاطر جمع
نہ زاد و راحلہ کا ساز و برگ خاطر خواہ
سنا یہ اور بہت ترش ہو کے فرمایا
کہ روکتا ہے مسلماں کو حج سے اے گمراہ
وہ بادشاہ کہ جو دشمنوں کو دیتا ہے
نگین و خاتم و طبل و نشان و تخت و کلاہ

خبر نہ لے گا وہ کیا اپنے میہمانوں کی
پہنچتے جو کہ ہیں طے کر کے برو بحر کی راہ
جنہیں فراغت و تنگی میں ہے اسی سے امید
جنہیں سلامت و آفت میں ہے اسی کی پناہ
وہ سن کے بولا کہ ناخواندہ میہمانوں کو
امید لطف کی رکھنی ہے میزباں سے گناہ
ذلیل ہوتے ہیں جو بن بلائے جاتے ہیں
طفیلیوں کی نہیں دعوتوں میں عزت و جاہ
یہ سن کے شیخ نے دیکھا اِدھر اُدھر کہ کہیں
ہو مدعی نہ تجسس میں یاں کوئی ہمراہ
بلا کے پاس پھر آہستہ اس سے فرمایا
ابھی زمانہ کی چالوں سے تو نہیں آگاہ
قدم پہنچتے جہاں تک ہیں پختہ کاروں کے
جوان خام کی واں تک نہیں پہنچتی نگاہ
خدا کے حکم ہیں جتنی تمام حکمت پہ
فتوح جن میں ہے دنیا و دیں کی خاطر خواہ

نماز روزہ ہو یا ہو طواف و عمرہ و حج
حصول جیسے کہ ہوتا ہے ان سے قربِ الٰہ
اسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام
نہ جن میں چاہیے محنت نہ کوششِ جانکاہ
مگر سلیقہ و تدبیر شرط ہے ورنہ
ہزاروں پھرتے ہیں حجاج سادہ لوح تباہ
یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار
وگرنہ علمِ معیشت وسیع ہے واللہ

آزادی کی قدر

ایک بندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنہیں
قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا
بینوا کو ہے زیادہ قدر دینار و درم
تُعرَفُ الاَشیاءُ بِالاَضدادِ ہے قولِ حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم
سن کے ایک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا
ہے سقر موری کے کیڑے کے لیے باغ ارم

انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں "آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آ کر کرامت ہے یہ انگلستان کی
اس کی سرحد میں غلاموں نے جو ہے رکھا قدم
اور کٹ کر پانو سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی"
قلبِ ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی
آن کر آزاد یاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام اس کی ہوا جن کو لگی

سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

سید احمد خاں کے اک حضرت نے یہ پوچھا کہ آپ
کس لیے سید سے صاف اے حضرتِ والا نہیں

کافر و ملحد ہمیشہ اس کو ٹھہراتے ہیں آپ
ثابت اسلام اس کا نزدیک آپ کے گویا نہیں

آپ بھی (نامِ خدا) ہیں تارکِ صوم و صلوٰۃ
اور سلوکِ اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں

خود نبوت پر سنے ہیں ہم نے ایراد آپ کے
اور الوہیت سے بھی دل جمع حضرت کا نہیں

چشم بد دور آپ کا بھی جب کہ ہے مشرب وسیع
پھر یہ سید پر تبرا آپ کو زیبا نہیں

سن کے فرمایا "اگر ہو پوچھتے انصاف سے
بات یہ ہے سن لو صاحب تم سے کچھ پردہ نہیں

رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

قحطِ اہل اللہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری
جو تھا سو چشمِ پرنم اپنا تھا یا پرایا
"دنیا سے اٹھ گئے سب جو تھے مریدِ صادق"
یہ کہکے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا
ہم نے کہا مریدی باقی رہی نہ پیری
یہ کہہ کے ہم بھی روئے اور اس کو بھی رلایا

نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر
درگزر تھی اور نہ ساتھ ان کے رعایت تھی کہیں
بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی ان کی معاف
کام سے مہلت کبھی ملتی نہ تھی ان کے تئیں
حسنِ خدمت پر اضافہ یا صلہ تو درکنار
ذکر کیا نکلے جو چھوٹے منہ سے اس کے آفریں
پاتے تھے آقا کو وہ ہوتے تھے جب اس سے دوچار
نتھنے پھولے منہ چڑھا ماتھے پہ بل ابرو پہ چیں
تھی نہ جز تنخواہ نوکر کے لیے کوئی فتوح
آ کے ہو جاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے امیں
رہتا تھا اک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس
فرض جس میں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعیں
گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار
زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انگبیں

حکم ہوتا تھا شرائط نامہ دکھلاؤ ہمیں
تا کہ یہ درخواست دیکھیں واجبی ہے یا نہیں

وہاں سوا تنخواہ کے تھا جس کا آقا ذمہ دار
تھیں کریں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمہ تھیں

دیکھ کر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب
تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مارِ آستیں

ایک دن آقا تھا اک منہ زور گھوڑے پر سوار
تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ نازنیں

دفعتہً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار
اور گرا اسوار، صدرِ زیں سے بالائے زمیں

کی بہت کوشش نہ چھوٹی پانو سے لیکن رکاب
کی نظر سائیس کی جانب کہ ہو آ کر معیں

تھا مگر سائیس ایسا سنگ دل اور بے وفا
دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں

دور ہی سے تھا اسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا
دیکھ لو سرکار اس میں شرط یہ لکھی نہیں

نیشن کی تعریف

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی راے
اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب
کہ نیشن وہ جماعت ہے کم از کم
زباں جس کی ہو ایک اور نسل و مذہب
مگر وسعت اسے بعضوں نے دی ہے
نہیں جو راے میں اپنی مذبذب
وہ نیشن کہتے ہیں اس بھیڑ کو بھی
کہ جس میں وحدتیں مفقود ہوں سب
زباں اس کی نہ ہو مفہوم اس کو
ہوں آدم تک جدا سب کے جدِ واَب
جو واحد لاشریک اس کا خدا ہو
تو لاکھوں اس کے ہوں معبود اور رب

صفائی نہ رکھنے کا عذر

راہ سے گزرا کہیں میلا کچیلا اک غلام
اس کے میلے پن پہ لوگوں نے ملامت اس کو کی
عرض کی "ایک اک رواں ہو جس بدن کا ملک غیر
اختیار اس کی صفائی کا نہیں رکھتے رہی"
جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال
عذر میلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی
کیونکہ جسم آدمی میں پیش اہلِ معرفت
کوئی چیز اس کی نہیں سب ہے امانت گور کی

دلی کی شاعری کا تنزل

اک دوست نے حالیؔ سے کہا از رہِ انصاف
کرتے ہیں پسند اہلِ زباں اس کے سخن کو
چند اہلِ زباں جن کو کہ دعویٰ تھا سخن کا
بولے کہ نہیں جانتے تم شعر کے فن کو
شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہلِ زباں سے
ہو چھو نہ گئی غیر زباں اس کے دہن کو
معلوم ہے حالی کا ہے جو مولد و منشا
اردو سے ہمارا واسطہ؟ حضرت کے وطن کو
اردو کے وطنی وہ ہیں جو دلی کے ہیں روڑے
پنجاب کو مس اس سے نہ پورب نہ دکن کو

بلبل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے
کیا عالمِ گلشن کی خبر زاغ و زغن کو

حالی کی زباں گر بمثل نہرِ لبن ہو
خالص نہ ہو تو کیجیے کیا لے کے لبن کو

ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ
پہنچے گا نہ وہ نافۂ آہوئے ختن کو

مانا کہ ہے بے ساختہ پن اس کے بیاں میں
کیا پھونکیے اس ساختہ بے ساختہ پن کو

یہ دوست نے حالی کے سنی جبکہ تعلّی
حق کہنے سے وہ رکھ نہ سکا باز دہن کو

کچھ شعر تھے یاد اُن کے پڑھے اور یہ پوچھا
کیوں صاحبو عزت اسی اردو سے ہے فن کو

سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے
کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

بیٹیوں کی نسبت

جاہلیت کے زمانہ میں یہ تھی رسمِ عرب
کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگ دل باپ اسے گود سے لے کر ماں کی
گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر
رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن
جو کہ اندھے ہیں بنے کہ نہیں کچھ ان کو خبر
لوگ بیٹی کے لیے ڈھونڈتے ہیں جب پیوند
سب سے اول انہیں ہوتا ہے یہ منظورِ نظر
ایسے گھر بیاہئے بیٹی کو جو ہو آسودہ
اور مہ و مہر سے جو دولت میں ہو افضل تر
جانے پہچانے ہوں سمدھیانے کے سارے زن و مرد

ان کے معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر
ایک ہی شہر میں ہوں دونو گھرانے آباد
دونو نزدیک قرابت میں ہوں باہم دیگر
جیتے جی مرگئی بس ان کی طرف سے گویا
جا کے پردیس میں بیٹی کو دیا بیاہ اگر
چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بر
بدمزاجی ہو جہالت ہو کہ ہو بدچلنی
کچھ برائی نہیں ذُتوَنتا ہو داماد اگر
وہ یہی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن
بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر
جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں
گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر
ساتھ بیٹی کے مگر اب پدرو مادر بھی
زندہ درگور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر
اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی
وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا
لیکن نہ اس کے ہاتھ کہیں نوکری لگی
اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی
تدبیر یہ بھی اس کی نہ تقدیر سے چلی
روزی کی خاطر اس نے کیے سیکڑوں جتن
پر کی کہیں نصیب نے اس کے نہ یاوری
راہِ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت
اک خضر پے خجستہ نے کی آ کے رہبری

جھک کر کہا یہ کان میں اس کے کہ آج کل
سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیفِ احمدی
جا اور لفظ لفظ کو اس کے پچھیڑ کر
تردید اس کی چھاپ دے جو ہو بری بھلی
پھر دیکھنا کہ راس و چپ و گرد و پیش سے
لگتی ہے کیسی آ کے زر و سیم کی جھڑی
دنیا طلب کو چاہئے ابلہ فریب ہو
دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہے ابلہی

یقین

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست
دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا

جی میں ترے ہزاروں گزرتے ہیں وسوسے
ہوتی نہیں قبول تری ایک اگر دعا

تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بت پرست
جس کا یقیں ہے تیرے یقیں سے کہیں سوا

وہ مانگتا بتوں سے مرادیں ہے عمر بھر
گو حاجت اس کی ان سے ہوئی ہے نہ ہو روا

آتا نہیں یقین میں اس کے کبھی قصور
امید اس کی روز فزوں ہے اور التجا

تو بندۂ غرض ہے وہ راضی رضا پہ ہے
وہ ہے کہ یہ ہے بندگی اے بندۂ خدا

استفادہ

لیجیے بھیک دوڑ کر گر ہے گداگری کا یہ
جس سے ملے جہاں ملے جو ملے اور جب ملے
ہے یہی اصل اکتساب ہو جیئے سب سے مستفید
زک ملے یا سزا ملے درس ملے ادب ملے

لائق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

قول اک حکیم کا ہے "کہ گر غور کیجیے
ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر
اول تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو
اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر
پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب
سو سو طرح سے وہ اسے کرتا ہے جلوہ گر
دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست
منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر

اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بد سگال
رکھتا ہے جو کہ دوست کے عیب اس سے مستتر''
گو قول ہے متین پہ جو تھی سخن کہ تہ
افسوس ہے حکیم کی پہنچی نہ وھاں نظر
دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید
عیب ان کے دوست کیوں نہ جتائیں گے بے خطر
اور جو کہ دوست سے نہیں سن سکتے اپنے عیب
وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہوں گے بہرہ ور
جن کو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یاں
موقوف عبرت ان کی نہ دشمن نہ دوست پہ

سخن سازی

ہے مرد سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اس کو
موجود سخن گو ہوں جہاں وہاں ہیں طبیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو
دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ
پر چپ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونو

عقل اور نفس کی گفتگو

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرے خوار و زبوں
اپنے دعووں پہ بیاں کر کے دلیل و برہاں
کہا اے نفس نہیں تجھ میں مآل اندیشی
درد ہیں تیرے اسی واسطے سب بے درماں
ہے غنیمت تجھے وہ رات کی دم بھر کی خوشی
جس کا آتا ہے نظر پیشتر از صبح زیاں
سود سے کچھ تجھے رغبت نہ زیاں سے پرہیز
تیرے نزدیک ہے درد اور دوا سب یکساں
نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر
یہ بھی ہے نیند کوئی موت کا ہے جس پہ گماں

نہ جوانی میں تجھے صبر نہ پیری میں شکیب
کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی کا طوفاں
کہیں جائے نہ بھٹک منزلِ مقصود سے تو
دیکھ جاتا ہے کدھر اور تجھے جانا ہے کہاں
ہاتھ دھو لذتِ فانی سے نہیں گر منظور
عیش باقی و حیاتِ ابدی سے حرماں
نفس نے عقل سے کی عرض کہ اے خضرِ طریق
وعظ پر تیرے ہے زیبا کہ فدا کیجیے جاں
پر نہیں حکم ترا کوئی عمل کے قابل
گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سراسر ہے بیاں
نقد کو چھوڑنا اور نسیہ کی رکھنی امید
کوئی تسلیم کرے گا نہ اسے جز ناداں
ہے یہ ایک ایک مری لذتِ فانی وہ بلا
سو حیاتیں ابدی تیری ہیں جس پر قرباں
ایک اب بھوکے سے کہتا ہے کہ اے قابِ طعام
ایک مدعو اسے کرتا ہے پس از سالِ رواں

کیونکہ امید پہ اک مائدۂ نعمت کی
سال بھر صبر کرے گر سنگی میں انساں
عقل نے سن کے کہا خوف ہے تجھ سے اے نفس
جُزبزہ تیرا تجھے دیکھئے پہنچائے کہاں
حق کے پیرایہ میں ہوتا نہیں باطل سرسبز
کیجیے لاکھ بیاں اس پہ دلیل و برہاں
جاں بلب بھوک سے ہو گرسنہ بالفرض اگر
زہر دانستہ کرے نوش نہیں یہ امکاں
نہ کہیں بھوک میں کھا بیٹھیو یہ لقمۂ نقد
اس کے کھانے میں نہیں جان کی خیر اے ناداں

عادت کا غلبہ عقل پر

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا
گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جا ے
ہنس کے عادت نے کہا کیا عقل ہے مجھ سے الگ
میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و را ے

شعرا کو سلطنت میں دخل دینا

سنتے ہیں یہ اک مدبر کی ہے رائے
''چاہیئے گر رونقِ علمِ زباں
شاعروں کو سلطنت کا کیجیے رکن
جن پہ اس کی سب رکانیں ہیں عیاں''
رائے صائب ہے بظاہر اور متیں
گو کیا اس کا نہیں کچھ امتحاں
شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ
ہے بہت کم برخلاف اس کے گماں

سلطنت کا پر خدا حافظ ہے جب
شاعروں کے ہاتھ ہو اس کی عناں
اور جو وہ شاعر ہیں ہندوستان کے
شعر و انشا کو بھی ہے خوفِ زیاں
ایک پر ان میں سے چل سکتا نہیں
دوسرے کا جادوے حسنِ بیاں
ایک جب چلنے نہ دے گا ایک کی
پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں

لوگ کسی کی خوبیاں سن کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنے کہ اس کے عیب سن کر

اپنے عیبوں کے ہیں ہم جتنے کہ ممنوں حالی
اس قدر خوبیوں کے اپنی نہیں شکر گزار
لوگ جب عیب ہمارا کوئی سن پاتے ہیں
گو کہ کرتے ہیں تأسُف کا بظاہر اظہار
پر خوشی کا ہے یہ عالم کہ ہو رنج ان کو کمال
گر نصیبوں سے وہ افواہ غلط پائے قرار
اور جو ہو گوش زد ان کے کوئی خوبی اپنی
خوش تو پڑتی ہے بنانی انہیں صورت ناچار
دل میں ہوتا ہے مگر غم کا یہ عالم ان کے
کہ ملال اپنا چھپا سکتے نہیں وہ زنہار
للہ الحمد کہ مخلوق کے خوش کرنے کا
نفس میں اپنے ہے سامان بہت کچھ طیار

شایستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال
انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اس کی جب یہی دیکھی گئی روش
پوچھا کسی نے اس سے کہ اس کا سبب ہے کیا
بولا کہ عادت اس لیے کی ہے یہ اختیار
چھٹ جائے تا کہ مجھ سے یہ لپکا سوال کا
پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک
آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار
منت سے عجز سے کبھی ملتا نہیں نکا

امید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت
گر چند روز اور رہا ان سے سابقہ
آیا جواب سن کے یہ اس کا بہت پسند
کی آفریں اور اس سے مخاطب نے یوں کہا
نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ
حق میں ترے مفید ہیں یہ ان سے بھی سوا
انگریز اگرچہ ہندیوں کے حق میں ہیں بخیل
اہل وطن پہ ان کی مگر جان ہے فدا
پر جو کہ دیسیوں میں ہیں تعلیم یافتہ
دل بھائیوں پہ بھی نہیں ان کا پسیجتا
انگریز اتنے اجنبیوں سے نہیں نفور
جتنے کہ یہ عزیز عزیزوں سے ہیں خفا
اہل غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہ
شائستگی کا زہر ہے جب سے انہیں چڑھا

اسراف

ایک مسرف نے یہ ممسک سے کہا
کب تک اے ناداں یہ حبِ مال و زر
تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ
ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر
ہنس کے ممسک نے کہا اے سادہ لوح
زر لٹا تا رائگاں اور اس قدر
آج ہی گویا (نصیبِ دشمناں)
آپ کا دنیا سے ہے عزمِ سفر

پاسِ نیک نامی

اے نیک نام شکر کر اللہ کا ادا
جس نے بنایا نیک تجھے کر کے نیک نام
ہوتا اگر نہ پاس تجھے نام نیک کا
پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
حاشا کہ تجھ کو خوفِ خدا کا ہو اس قدر
جتنا کہ خوفِ طعنہ و تشنیعِ خاص و عام

غرورِ نیک نام

گئی ہے حد سے گزر شیخ کی نکو نامی
گمانِ بد کبھی اس کی طرف نہیں جاتا
جو اس کے عیب قسم سے بیاں کرے کوئی
خود اس کو عیب کا اپنے یقیں نہیں آتا

کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل مگر پہلا سوارِ راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونو رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونو خواستگار
راہ میں دونو کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت
کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی
آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار

آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونو پیش و پس
ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آ کے دونو کی سنی جب سرگزشت
تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھ بھی جس میں تصدیقِ مرض
اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

خودستائی

اے دل بشر وہ کون ہے جو خود ستا نہیں
پر خود ستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا
جو زیورِ خرد سے معرّا ہیں سادہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا
جو ان سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وہ
پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا
کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج
کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دے دیا
کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل
سائل کی ڈپ میں میں نے دیا مال جب دکھا

پردہ میں زیرکی کے چھپاتا ہے بخل یہ
اور بن کے بے وقوف جتاتا ہے وہ سخا
کچھ اس لیے کہ ہم بھی انہیں میں سے ہوں شمار
اہلِ وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
کچھ اس لیے کہ اپنا ہو انصاف آشکار
کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا
کہتا ہے ایکؔ لاکھ نہ مانے برا کوئی
ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا
کہتا ہے ایک گر ہے خوشامد کا اور ہی
پرچاتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم برا
دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ
اور منہ سے درد کہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا
چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
یعنی کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا
کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حسنِ ظن ہے یہ
اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا

قانع ہے وہ انھیں پہ ہوئی وصف جو بیاں
اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا

کہتا ہے زید عمرو ہے شدت سے سادہ لوح
گنتا ہے سب کو نیک وہ اچھا ہو یا برا

کہتا ہے عمرو زید بھی کتنا ہے عیب میں
بد ہو کہ نیک اس کی زباں سے نہیں بچا

یہ اس کا اور وہ اس کا بیاں کر کے کوئی عیب
ہر اک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا

غیبت امید ہے کہ نہ ہوتی جہان میں
ہوتا اگر یہ خاک کا پتلا نہ خود ستا

حالی جو پتڑے کھول رہے ہیں جہان کے
شاید کہ اس سے آپ کا ہو گا یہ مدعا

یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب
اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا

القصہ جس کو دیکھیے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بیچارہ مبتلا

حملۂ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفسِ دوں ہمارے بس میں ہے
گر کبھی حملہ پہ اس کے غالب آ جاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی
جن کو نادانی سے حملے اس کے ٹھیراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیئے سب عقل نے ہتھیار ڈال
زورِ بازو پر ہمیشہ جس کے اِتراتے تھے ہم

جس قوم میں افلاس ہوا اُس میں
بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا
جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور
جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے پر بخل سے کمتر
ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا
یاروں کے لیے ہے یہ بیاں موجب رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اس وقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت

وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تونگر
پھر اس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

رؤسائے عہد کی فیاضی

کی رئیسِ شہر کی تعریف یاروں نے بہت
بر سبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اس کا چلا
بولے آج اس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر
عاملانِ شہر مدعو اس کے رہتے ہیں سدا
ضلع کے حکام کا ادنیٰ اشارہ چاہیے
پھر کوئی دیکھے سخاوت اس کی اور بذل و عطا
یادگاریں جتنی ہیں اعیانِ دولت کی بنیں
ان میں صرف اس کی رقم ہے سب کے چندے سے سوا
پالکی یا ویگنٹ ہے جو سواری اس کے پاس
اہلکاروں کے لیے ہے وقف بے چون و چرا

کیا کلکٹر کیا کمشنر کیا سپاہی کیا عسس
اس کی ہمت کے ہیں سب مداح بے رُو و ریا
جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام
جوڑ کر ہاتھ ان سے حالی نے بصد منت کہا
عیب بھی اس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں
سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

ایمان کی تعریف

فقیہِ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف
تو دی چراغ سے اس کو بہ آب و تاب مثال
کہا فتیلۂ اقرار باللساں ہے ضرور
جہاں ہو آتشِ تصدیق و روغنِ اعمال
کہا کسی نے کہ نکلا یہاں ذنوں اک تیل
نہیں ضرور فتیلہ کا جس میں استعمال

برکتِ اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اک آزادہ کہ ہے جن میں ملاپ
دولت و بخت ہے ہر حال میں ان کے ہمراہ
نہ انہیں حاجتِ اعواں نہ تلاشِ انصار
نہ انہیں خوفِ بد اندیش نہ بیمِ بدخواہ
پر نہیں رابطہ جس قوم میں اور یکجہتی
اس کی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت و جاہ
نہ ملاذ ان کے لیے قلعہ نہ خندق نہ فصیل
نہ مفید ان کے لیے فوج نہ لشکر نہ سپاہ
ایک ملا نے سنا جب یہ سخن فرمایا
تکیہ اور اس قدر اسباب پہ کرنا ہے گناہ

اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں
دستِ قدرت کے ہے سب ہاتھ سفید اور سیاہ
واں نہ ملت کی ضرورت ہے نہ کچھ پھوٹ کا ڈر
پڑ گئی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ
کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دے ساتھ اگر
کر دیں افراد پراگندہ جماعت کو تباہ
پر مجھے خوب ہے اللہ کی عادت معلوم
اس کو جب دیکھا ہے دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

بُعدِ صوری مانع قربِ معنوی نہیں ہے

حالی نے جو رہنے کے لیے شہر میں اک گھر
جا اپنے محلّہ سے کہیں دور بنایا
جب اہلِ محلّہ سے چلا ہو کے وہ رخصت
دل دردِ جدائی سے عزیزوں کا بھر آیا
ہمسایہ و احباب لگے کرنے سب افسوس
اک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا
بلی کہ جو بے عقل ہے دم دیتی ہے گھر پر
اتنی بھی محبت تمہیں گھر سے نہیں آیا
حالی نے کہا انس ہے چیز اور وفا اور
بلی نے مزا پھل کا وفا کے نہیں پایا

اس مہر و وفا کی نہیں ملی پہ پڑی چھینٹ
کتے نے ہے جس کا کہ سبق ہم کو پڑھایا

ہم غش ہیں مکینوں پہ وہ عاشق ہے مکاں کی
گھر بھول گئے ہم تو نہیں تم کو بھلایا

گھر دل میں ہو یاروں کا تو پھر گھر ہے برابر
مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بسایا

ناصحِ مخلص اور اہلِ غرض میں تمیز

منصور نے یہ جعفرِ صادق سے عرض کی
محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا ہر بشر
کرتے رہیں گر آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ
ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کی بہرہ ور
فرمایا ''ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
لائیں گے وہ نہ حرفِ نصیحت زبان پر
اور جن سے ہے امیدِ نصیحت وہ بالیقیں
صحبت میں بیٹھنے سے کریں گے تری حذر''

خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں

کہتے ہیں خدام ماموں کے بہت گستاخ تھے
ایک دن خادم کی گستاخی پہ ماموں نے کہا
کوئی آقا جب کہ خوش اخلاق ہوتا ہے بہت
پیش خدمت اس کے بداخلاق ہوتے ہیں سدا
پر جو سچ پوچھو تو ہوتا خادموں کا شوخ چشم
ہے دلیل اس کی کہ ہے خود خلق آقا کا برا
کھو دیا ہیبت کو اپنی جس نے اور تمکین کو
اس نے گویا ڈھا دیا رکنِ رکیں اخلاق کا

خوشامد کرنے کی ضرورت

متوکل کا تیر چڑیا پر
ہو گیا اتفاق سے جو خطا
ابنِ حمدوں ندیم تھا حاضر
کی خلیفہ کی مدح اور یہ کہا
''جن کو خلقِ خدا پہ شفقت ہے
خوں بہانا نہیں وہ رکھتے روا
جا نہ سکتی تھی بچ کے تیر سے وہ
تو نے دی قصداً اس کی جان بچا''
ابنِ حمدوں نے کی یہ دانائی
کہ خوشامد سے یوں اسے تھپکا

دور تھا ورنہ کیا خلیفہ سے
ہو کے اپنی خطا سے کھسیانا
جائے گنجشک ابنِ حمدوں پر
تیر کا اپنے امتحاں کرتا
ابنِ حمدوں کی جان گو جاتی
دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا

رعیت پر نااہل کو مسلط کرنا

ہاروں نے کہا مصر لگا ہاتھ جب اس کے
''فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا
وہ خطۂ ملعوں تھا یہی جس کی بدولت
تھا دل میں خدائی کا خیال اس کے سمایا
میں بھی اسے اس باغیِ طاغی کے علی الرغم
اک بندۂ بے قدر کو بخشوں گا خدایا
کہتے ہیں خضیب ایک غلامِ حبشی تھا
جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
کی سلطنتِ مصر کی باگ اس کے حوالے
نا اہل کے پنجہ میں اہالی کو پھنسایا

باڑی گئی بہ ایک برس نیل کی رو میں
یہ حادثہ آ اسکو کسانوں نے سنایا
فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اون
ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اٹھایا
ہارون نے سمجھا کہ ودیعت ہے خدا کی
محکوم ہے جو میری رعایا و برایا
فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا
اپنے کو خدا جس نے ہے عالم کو بنایا
جوکھوں میں نہ یوں ڈالتا مخلوق کو اپنی
اک سفلۂ ناکس کی بنا اس کو رعایا

رشک

ظاہرا مردوں کی طینت میں نہیں رشک اس قدر
ہے طبیعت میں وہ جتنا عورتوں کی جاگزیں
ایک شہزادی کہ اکلوتی تھی جو ماں باپ کی
تختِ شاہی پر ہوئی بعد از پدر مسند نشیں
سلطنت میں اس کی تھا مردوں کو کلی اختیار
عورتیں اصلاً دخیل اس کی حکومت میں نہ تھیں
مرد ہی تھے اس کے محرم مرد ہی اس کے مشیر
تھا نہ عورت کا پتا دربار میں اس کے کہیں
تخلیہ میں ایک دن جب چند حاضر تھے ندیم
ہنس کے فرمایا کہ اے دولت کے ارکانِ رکیں

مرد ہونے کے سبب تم سے نہیں مانوس میں
بلکہ ہے انس اس لیے تم سے کہ تم عورت نہیں

بات کی حسنِ بیاں سے اس نے دی صورت بدل
تا کہ کوئی سوءِ ظن اس پر نہ کر بیٹھے کہیں

ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت سے مجھے
اس لیے نفرت کہ ہے مردوں کی صورت دل نشیں

قانون

کہتے ہیں ہر فرد انساں پر ہے فرض
ماننا قانون کا بعد از خدا
پر جو سچ پوچھو نہیں قانون میں
جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا
اس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں
اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا
پر اسے دیتے ہیں توڑ اک آن میں
جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا
حق میں کم زوروں کے ہے قانون وہ
اور نظر میں زور مندوں کی ہے لا

شادی قبل از بلوغ

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو
تختِ پدر پہ اس کو ممنوع ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ ان عقلوں نے
عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اس کی قبل از بلوغ شادی
کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا
نزدیک ان کے گویا بر زعم عقل و دانش
ہے گنگذم سے آساں میڈم کو بس میں لانا

حرص

اثنائے وعظ میں ہے تکیہ کلامِ واعظ
قدرِ قلیل ہے سب مال و منالِ دنیا
گویا کہ حرص اس کی اس سے بجھی نہیں ہے
ہے جس قدر فراہم پاس اس کے مالِ دنیا

اُمرا اور عُقلا

جاتے ہیں اگر پاس امیروں کے خردمند
وہ جانتے ہیں جو کہ ہے جانے کی ضرورت
پر اپنی ضرورت سے خبردار نہیں ہیں
ملتے عُقلا سے نہیں جو صاحب ثروت
بیمار کے محتاج ہیں جتنے کہ اطبّا
بیمار کو کچھ اس سے سوا ان کی ہے حاجت

عصمت بی بی از بے چادری

اے بینواؤ ہنستے ہو کیا منعموں پہ تم
اخلاق میں کچھ ان کے اگر آ گیا بگاڑ
تم زد سے نفس کی ہو جبھی تک بچے ہوئے
ہو جب تلک کہ پکڑے ہوئے مفلسی کی آڑ
اسباب جو کہ جمع ہیں منعم کے گرد و پیش
گر تم کو ہوں نصیب تو دنیا کو دو اجاڑ

سچ کہاں ہے

دیکھنے ہوں تمہیں گر جھوٹ کے انبار لگے
دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں
سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

کھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام
اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقتِ باز پرس
اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

خوشامد کے معنی

خوشامد کرتے ہیں آ آ کے جو لوگ
تمہاری ہر دم اے اربابِ دولت
خوشامد پر نہ ان کی بھولنا تم
وہ گویا تم کو کرتے ہیں ملامت
کہ جو ہم نے بیاں کیں خصلتیں نیک
نہیں ان میں سے تم میں ایک خصلت

تدبیرِ قیامِ سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پانو جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی
یہ حرفِ سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر
مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سبک ہو اسے منہ سے نہ نکالو

مرد اور عورت کی حکومت کا فرق

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ اکثر
مردوں کی حکومت میں ہے ملکوں کی بری گت
لیکن بخلاف اس کے ہے عورت کا جہاں راج
وھاں ملک ہے سرسبز اور آباد رعیت
فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاں دار
قبضہ میں ہے وھاں عورتوں کے دولت و مکنت
اور سر پہ ہے عورت کے جہاں افسر شاہی
سمجھو کہ ہے اس ملک میں مردوں کی حکومت

مغرور کی پہچان

غرۂ زید کی کرتا ہے گر شکایت عمرو
تو سمجھو کرتا ہے اپنے غرور کا اقرار
جنہوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا
بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار

کام اچھا کرنا چاہیے نہ جلد

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
اس نے کی تاخیر اس میں جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

گدائے مبرم

اک برہمن مورتی کے سامنے باصد نیاز
مانگتا تھا ہاتھ پھیلائے دعا بیٹھا کہیں
آن نکلا بانوا اک مانگتا کھاتا ادھر
دیکھ محویت برہمن کی گیا بس جم وہیں
جی میں آیا چھیڑ کر قائل برہمن کو کرے
تا کہ پوجے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہو کر شرمگیں
مورتی کے سامنے جب کر چکا وہ التجا
بانوا بولا کہ ہے تو بھی عجب کوتاہ بیں
مورتی کچھ تجھ کو دے گی اور نہ دے سکتی ہے وہ
ناحق اتنی التجائیں اس کے آگے تو نے کیں
ہنس کے برہم نے کہا ہے مانگنا بندہ کا کام
دے نہ دے وہ اس سے کچھ مطلب نہیں اپنے تئیں
ہم نہیں دیتے ڈھئی تم جیسے ڈھیٹوں کی طرح
ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن پانو پھیلاتے نہیں

بے اعتدالی

تم اے خود پرستو طبیعت کے بندو
ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز
جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس ادھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت
تو چیخ اٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
جو مجرے میں بیٹھو تو اٹھو نہ جب تک
کہ اٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر چل پڑے چوسر و گنجفہ پر
تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے

پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو
کہ بس ٹھن گئے عزم جنگ تتر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر
تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہے تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو
کہ چھوڑیں گے اب آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی
رہیں پانو کے ہوش جس میں نہ سر کے
جو کھانا تو بے حد جو پینا تو ات گت
غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے

بشر کے صدمہ سے ہوتا ہے ہر بشر کو ملال
کہ ایک جڑ کی ہیں سب ٹہنیاں صغار و کبار
یہ صدمہ گر غلطی سے کسی کی پڑتا ہے
تو اور بھی اسے دیتا ہے انفعال فشار
یہی سبب ہے کہ ہوتے نہیں طبیب ملول
جو چل بسے کوئی ان کے علاج میں بیمار
وہ جانتے ہیں کہ تھپ جائے گی خطا ہم پر
کیا ملال کا اپنے گر اس جگہ اظہار

اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

گو آدمی کا حافظہ کیسا ہی ہو قوی
پر بھول چوک ہے بشریت کا مقتضا
ہوتا ہے اس سے کارِ نمایاں کوئی اگر
کرتا ہے بار بار بیاں اس کو برملا
یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہیے
ہر بار اپنی مدح کا پیرایہ اک جدا
پر اتفاق سے نہیں رہتا یہ اس کو یاد
یاروں سے میں بیان ابھی کر چکا ہوں کیا
بھولے نہ اپنی یاد پہ انساں کو چاہیے
آخر بشر کا خاصہ ہے سہو اور خطا

فضول خرچی کا انجام

سرے پہ راہ کے بیٹھا تھا اک گدائے ظریف
جہاں سے ہو کے گزرتے تھے سب صغیر و کبیر
ہر اک سے ایک درم مانگتا تھا بے کم و بیش
سخی ہو اس میں کہ ممسک' غریب ہو کہ امیر
فضول خرچ تھا بستی میں ایک دولت مند
کہ جس کا تھا کوئی اسراف میں نہ شبہ و نظیر
ہوا جو ایک دن اس راہ سے گزر اس کا
درم اک اس نے بھی چاہا کہ کیجے نذرِ فقیر
کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت
کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شعیر

پہ لوں گا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار
کہ دولت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پذیر
یہی للے تللے رہے تو آپ کو بھی
ہماری طرح سے ہونا ہے ایک روز فقیر
سو وقت ہے یہی لینے کا خود بدولت سے
دکھائے دیکھیے پھر اس کے بعد کیا تقدیر

اختلافِ مذہب رفع نہیں ہو سکتا

غیر ممکن ہے کہ اٹھ جائے دلیل و بحث سے
جو چلا آتا ہے باہم اہلِ مذہب میں خلاف
ہو نہیں سکتا مطابق جبکہ دو گھڑیوں کا وقت
رفع ہو سکتے ہیں پھر کیونکر ہزاروں اختلاف

انسان جو اشرف المخلوقات ہے سب سے زیادہ موردِ آفات ہے

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار
دو ہیں ان میں سے نہایت جانگزا
ایک فکر اس آنے والے وقت کی
شک نہیں ہے جس کے آنے میں ذرا
دوسرے چوٹیں زبانِ خلق کی
زخم جن کا زخم ہے تلوار کا
اور بھی حیوانِ ناطق کے لیے
ہیں بہت سی زحمتیں ان کے سوا
پر گدھے اور اور حیوانات سب
رہتے ہیں دور ان گزندوں سے سدا
کیسا ان آلام سے رہتا نچنت
اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا

چنڈو بازی کا انجام

ایک متوالے سے چنڈو کے وہ تھا ہوش میں جب
پوچھا ناصح نے کہ اس کام کا آخر انجام
بولا انجام وہی جو کہ ہے سب کو معلوم
زندگانی کو وداع اور جوانی کو سلام
آنکھ میں اپنے پرائے کی ٹھہرنا بے قدر
شہر کے کوچہ و بازار میں رہنا بدنام
جس سے عقبیٰ ہو درست ایسا نہ بوتا کوئی بیج
جس سے دنیا میں ہو نام ایسا نہ کرتا کوئی کام
ہم پہ آئینہ ہے جو حال ہے ہوتا اپنا
نفسِ سرکش کے مگر ہاتھ میں ہے اپنی زمام

کہا ناصح نے کہ انجام ہو معلوم اگر
لے نہ اس زہرِ ہلاہل کا کوئی بھول کے نام
یہ تو کہتے ہو کہ انجام برا ہے لیکن
یہ بتاؤ کہ برا ہوتا ہے کیسا انجام
برے انجام کی تب ہو گی حقیقت روشن
برے انجام سے جب آ کے پڑے گا خود کام
مرنے والے ہی کو ہے موت کی لذت معلوم
گو کہ رکھتے ہیں یقیں موت کا سب پختہ و خام

قوم کی پاسداری

اک مسلماں خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں
پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر
چاہتے ہیں نفع پہنچے اپنے اہلِ ملک کو
گو کہ ان کے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
کارخانہ کا یہ ہے راجس کے کبھی چاکو نہ لیں
اس کا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
خوردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں انہیں
ان کو لندن سے منگائیں بس چلے ان کا اگر
الغرض اہلِ وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
جانتے ہیں دین و ایماں اپنا قصہ مختصر
سن کے حالی نے کہا ہے حصر انگریزوں پہ کیا
ایک سے ہے ایک قوم اس عیب میں آلودہ تر

ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبول اس پہ ہے طبعِ بشر

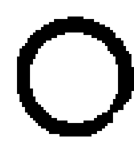
مکھیاں جیتی نگل جاتے ہیں پاسِ قوم میں
اچھے اچھے راست باز اور حق پسند اور داد گر

ہاں بری اس عیب سے لے دے کے اس دنیا میں ہے
چشمِ بددور امتِ مرحوم اے جانِ پدر

اور قوموں سے انہیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی فوج پر

ہو گا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو یاں
جس قدر ہے ان سے اپنوں اور یگانوں کو خطر

غزلیاتِ قدیم وجدید



قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہو گا حق کیونکر ادا تیرا

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم
کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کھلا تیرا

جچتا نہیں نظروں میں یاں خلعتِ سلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

قطعہ

عظمت تری مانے بن کچھ بن نہیں آتی یاں
ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا

تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط ان کو
جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا

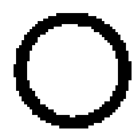
نشہ میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بے خود
جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا

سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے
جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

طاعت میں ادب تیرا عصیاں سے ہے گو بڑھ کر
عصیاں میں ہے طاعت سے اقرار سوا تیرا

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے
کچھ رنگِ بیاں حالی ہے سب سے جدا تیرا



کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا

کاوش میں ہے الٰہی دگدا میں ہے طبیعی
جو حل ہوا، نہ ہوگا، وہ ہے سوال تیرا

چھوٹے ہوئے ہیں گو جی، پر دل بندھے ہوئے ہیں
ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی
پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا

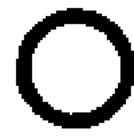
ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا

دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا

ہے پور زال سے دل اس کا قوی زیادہ
رکھتی ہے آسرا یاں جو پیرِ زال تیرا

ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی
یا رب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا

بیگانگی میں حالی یہ رنگِ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں گے قال اہلِ حال تیرا



رہِ رو میں دشتِ جنوں کی تیرے عجب مزا خوشگوار دیکھا
نہ اس سفر میں تکان دیکھی نہ اس نشے میں خمار دیکھا

نہ جی رکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
رہے سدا نامراد جو یاں انہیں بھی امیدوار دیکھا

رخِ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افروز جس چمن میں
نہ بلبل و گل میں وھاں تعلق نہ سرو و قمری میں پیار دیکھا

سوارِ محمل کی جستجو میں ہزاروں دشتِ طلب میں دوڑے
نہ محمل آیا نظر نہ ناقہ فقط کچھ اٹھتا غبار دیکھا

جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھلا بھی قسمت سے بھید تیرا
ملا نہ کھوج اس کا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا

لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریائے پر خطر سے
گئے وہ کود آنکھ بند کر کے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا

بچے ہوئے کاہشوں سے یاں کی وہی ہیں جو تیرے ہو رہے ہیں
وگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا

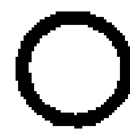
چمن میں بھولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے
گل ان کی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا

خبر نہیں یہ کہ کیا ہے، کیسا ہے، کون ہے اور تو کہاں ہے
پہ اپنے میں اور تجھ میں ہم نے علاقہ اک استوار دیکھا

سلوک ہیں تیرے سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہوں یا مسلماں
نہ ان سے کچھ تیرا بیر پایا نہ ان سے کچھ تیرا پیار دیکھا

سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دیئے ہاتھ باندھ سب کے
جنھیں تھا یاں اختیار سب کچھ انھیں بھی بے اختیار دیکھا

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بے کار تجھ کو پایا کبھی نہ سرگرمِ کار دیکھا



پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا
چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا

مضموں ہے نقشِ دل میں لَدَینا مَزِید کا
کونین سے بھرے گا نہ دامن امید کا

قفلِ درِ مراد سب اک بار کھل گئے
چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا

دیکھا ہے ہم نے عالمِ رحمت کو غور سے
ہے شش جہت میں قحط دلِ ناامید کا

شرمِ کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں
انجام ایک ہو گا شقی و سعید کا

ہے نردبانِ جذبۂ توفیق درمیاں
یاں امتیاز کیا ہے قریب و بعید کا

ہے آسماں پہ تیرے جگر خوار کا دماغ
خونِ جگر میں نشہ ہے جامِ نبید کا

تسکیں نہیں مشاہدۂ گاہ گاہ سے
یا رب یہ روزہ دار ہے مشتاق عید کا

دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر
لَاتَقنَطُوْا جواب ہے ھَل مِن مَّزِید کا

حالی کی ہیں اگر یہی شیوا بیانیاں
لے گا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

نعت

یا ملکیّ الصفات یا بشریّ القُویٰ
فیک دلیلٌ علی اِنّکَ خیر الوریٰ

تجھ سے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ باراں سے خاک
خَلقکُ خصبُ الزّمان بعثک مَحیاَ الوریٰ

دعوے روشن ترا ثابتِ بے بیّنہ
صورت و سیرت تری صدق پہ تیرا گوا

قال ترا اور حال نشہ وحدت میں چور
اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

غیب سے بھیجا تجھے ٹاپتا پھرتا تھا جب
دشت میں بھٹکا ہوا قافلہ بے رہنما

اٹھا ہدایت کو تو عین ضرورت کے وقت
جیسے کہ ہنگامِ قحط قبلہ سے اٹھے گھٹا

شانِ رسالت کی تھی تیری جبیں سے عیاں
گود سے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی جدا

گلہ بنی سعد کا جب کہ چراتا تھا تو
گلۂ آدم تجھے سونپ چکی تھی قضا

دوڑ پڑے سوئے حق کاٹ کے سب بیڑیاں
امیوں کے جب پڑی کان میں تیری صدا

راہب و قسیس و حبر رہ گئے دل تھام کر
دیکھ کے تیرا قدم ہم قدم انبیا

خاک تھی جس ملک کی مزرعِ شر و فساد
تو نے اسی کو دیا ارضِ مقدس بنا

تو نے تحمل کیا قوم کا غلبہ تھا جب
جب ہوئی مغلوب قوم تو نے ترحم کیا

چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھورے بہت
تو نے کیا دام دام قرض سب ان کا ادا

تو نے کیا سرِ حق عارف و عامی پہ فاش
ایک کو سمجھا دیا ایک کو دکھلا دیا

چوٹ سے حق کی رہا دل نہ اچھوتا کوئی
ایک کے چرکا لگا ایک کو گھائل کیا

حجتِ حق کر چکا دین ترا جب تمام
پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جما

دیر ہوئے بے چراغ اور صلوٰتِ یہود
شرک ہوا مضمحل اور کہانت ہبا

بجھ گئے آتش کدے بیٹھ گئے بت کدے
ہو گئی تثلیث مات اور ثنویت فنا

اٹھے بہت مدعی جیسے کہ ساون میں گھانس
مرحلہ پر چند روز پاتی ہے نشو و نما

غیرتِ حق نے مگر جلد لیا انتقام
مل گئے اٹھ اٹھ کے سب خاک میں اہلِ ہوا

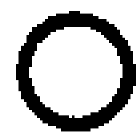
رہ گیا نامِ سجاح کذب میں ضربُ المثل
اسود و ابنِ کثیر خوار ہوئے برملا

سلسلۂ انبیاء ختم نہ ہوتا اگر
حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اٹھا

آتے ہی چشمہ دیا تو نے کوئیں سے نکال
جس کو چلے آتے تھے کھودتے سب انبیا

بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ
بھیج چکا تیرے ہاتھ ملتِ بیضا خدا

تجھ پہ صلوٰۃ و سلام رُبِّ سمٰوات سے
روز و شب و صبح و شام قدرِ رمال و حصے



اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا

رایوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے
گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ
جو گنج تو نے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا

جس رہگذر میں بیٹھا تو غول راہ بن کر
صنعاں سے راست رو کو رستہ بھلا کے چھوڑا

فرہاد کوہکن کی لی تو نے جان شیریں
اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

یعقوبؑ سے بشر کو دی تو نے ناصبوری
یوسفؑ سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

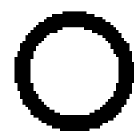
لاگ اور لگاؤ دونو ہیں دل گداز تیرے
پتھر کے دل تھے جن کے ان کو رلا کے چھوڑا

عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چپقلش جہاں کی
عقل و خرد کا تو نے خاکا اڑا کے چھوڑا

علم و ادب رہے ہیں دلبے ترے ہمیشہ
ہر معرکہ میں تو نے ان کو دلا کے چھوڑا

افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دلکش
شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا



دیکھ اے امید کچھ ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا

مے خانہ کی خرابی جی دیکھ کر بھر آیا
مدت کے بعد کل وھاں جا نکلے تھے قضارا

اک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے
اے زاہدو تمہارا ہے اس میں کیا اجارا

دنیا کے خرخشوں سے چیخ اٹھے تھے ہم اول
آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

توفیق نے ہمیشہ لی کشتی پر خبر یاں
جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا

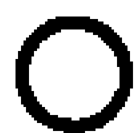
انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے
جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا

افسوس اہل دیں بھی مانند اہل دنیا
خود کام و خودنما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمہارا

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

حالی سے کام ہے یاں فعلوں سے اس کے کیا کام
اچھا ہے یا برا ہے پھر یار ہے ہمارا



رونا نہ ہو گا حالی شاید یہ کم تمہارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمہارا

الفت میں دم بدم کچھ لذت ہے بڑھتی جاتی
چھوڑے گا کھا کے شاید عاشق کو غم تمہارا

عاقل ہیں شہر میں کم ناداں بہت ہیں واعظ
ہے مصلحت کہ اکثر بھرتے ہیں دم تمہارا

دلجُو نہیں کوئی یاں حیف اے صنم پرستو
دلکش بہت تھا ورنہ بیتُ الصَّنَم تمہارا

گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم
اپنی نظر میں ہو گا گر وزن کم تمہارا

دشت طلب کے رستو طے ہو گے کس طرح تم
آتا نہیں سمجھ میں کچھ پیچ و خم تمہارا

دو بینواؤں کو بھی کچھ جم کے جانشینو
بس جامِ جم ہمارا اور ملکِ جم تمہارا

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا
دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

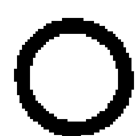
کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا

ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رو دیئے سوارو
ہے لاکھ لاکھ من کا ایک اک قدم تمہارا

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملو گے
گزرا ابھی ہے یاں سے خیل و حشم تمہارا

پھرتے ادھر ادھر ہو کس کی تلاش میں تم
گم ہے تمہیں میں یارو باغِ ارم تمہارا

جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالی
کچھ کر کے بھی دکھائے زورِ قلم تمہارا



وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
پہنچا ہی بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا

خود مہرِ وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

دلی سے نکلتے ہی ہُوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

یا رب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل
جس دن کہ یہ دونو نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و حرماں
چھل بل میں تم اس زالِ فسوں گر کی نہ آنا

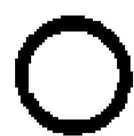
افسوس کہ غفلت میں کٹا عہدِ جوانی
تھا آبِ بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا

یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی
اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سنانا

دنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دن
وہ دن ہے کہ جس دن ہے اسے چھوڑ کے جانا

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت
فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانہ

ڈھارس سی کچھ اے ہم قدمو تم سے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا



جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی نہ جاننا اس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اس کو تصور اپنا نہ کیجیے گا

سنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعویٰ
یہ کہہ دو دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا

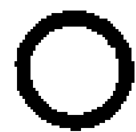
اسی میں ہے خیر حضرتِ دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجیے گا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانہ کی خُو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

کمال ہے ضدِ بے کمالی نہیں ملاپ ان میں حرف گیرو
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بے جا نہ کیجیے گا

لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ دردِ الفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجیے گا

تمہارا تھا دوست دار حالی اور اپنے بیگانہ کا رِضا جُو
سلوک اس سے کیے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجیے گا



ہو عزمِ دیر شاید کعبہ سے پھر کر اپنا
آتا ہے دور ہی سے ہم کو نظر گھر اپنا

قیدِ خرد میں رہتے آتے نہیں نظر ہم
وحشت رہے گی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا

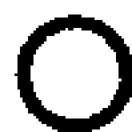
پیرِ مغاں سے ہو کر تب سرخرو ملیں گے
فضل و ہنر کا ہو گا جب چاک محضر اپنا

بیگانہ وش ہے گروہ تو ہے ہمارے ڈھب کا
ایسوں ہی سے نبھا ہے یارانہ اکثر اپنا

عصمت پہ اپنی تھی خود فطرت گواہ اپنی
گر بیٹھے اپنے ہاتھوں ہم چاک محضر اپنا

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

غیروں کو لیں گے آخر اپنا بنا کے کیا ہم
اپنوں ہی سے ہے حالی کچھ دل مکدر اپنا



معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

اے بانگِ طبلِ شاہی دن ہو گیا جب آخر
خوابِ گراں سے تو نے ناحق ہمیں جگایا

تھا ہوش یادِ گُل کا دورِ خزاں میں کس کو
اے عندلیبِ نالاں یہ تو نے گُل کھلایا

ویراں ہے باغ تس پر پھولی نہیں سماتی
مژدہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سنایا

اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا

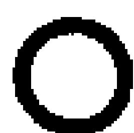
ڈرتے رہیں گے اب ہم بے جرم بھی سزا سے
احسان اس کا جس نے ناحق ہمیں ستایا

واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم
کوئی جوابِ شافی پر اس سے بن نہ آیا

آیا نہ تھا کبھی یاں گویا قدم خزاں کا
دو دن میں یوں پلٹ دی کس نے چمن کی کایا

تقلیدِ قوم ہی پر گر ہے مدارِ تحسیں
تو ہم نے دوستوں کی تحسیں سے ہاتھ اٹھایا

دیکھا تو کچھ نظر میں حالی جچا نہ اپنی
جو جو گماں تھے ہم کو ان کا نشاں نہ پایا



نفس دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ اترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا

حق نے احساں میں نہ کی اور میں نے کفراں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا

چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی
چپکے چپکے نفس خائن کا کہا کرتا رہا

طاعنوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہِ خطا
وار ان کا اس لیے اکثر خطا کرتا رہا

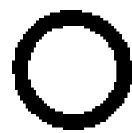
نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی
اس کو حیلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا

منہ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں
ان سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

تھا نہ استحقاقِ تحسیں پر سنی تحسیں سدا
حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا

شہرت اپنی جس قدر بڑھتی گئی آفاق میں
کبرِ نفس اتنا ہی یاں نشو ونما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا



کہیں الہام منوانا پڑے گا
کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد
یہ گر ناصح کو بتلانا پڑے گا

جنہیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا
انہیں سچوں کو جھٹلانا پڑے گا

عوام الناس کا ہو گا جنہیں مونہہ
انہیں خاصوں پہ مونہہ آنا پڑے گا

رہے وصفِ جناں کی مشق واعظ
تمہیں بچوں کو پھسلانا پڑے گا

سخن میں پیروی کی گر سلف کی
انہیں باتوں کو دہرانا پڑے گا

قطعہ

تعلق کا ہے پھندا پیچ در پیچ
یہ عقدہ ہم کو سلجھانا پڑے گا

بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے
بس اب دنیا کو ٹھکرانا پڑے گا

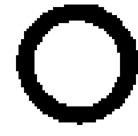
نہیں بُو اُنس کی اس غم کدے میں
کہیں دل جا کے بہلانا پڑے گا

دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے
ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا

زمانہ کر رہا ہے قطعِ پیوند
وفا سے ہم کو پچھتانا پڑے گا

جو منصوبے ہیں یہ حالی تو شاید
ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا



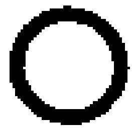
سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی
تمہیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا

رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی
بس اب دل سے شکووں کو دھونا پڑے گا

بن آئے گی ہرگز نہ یاں کچھ کیے بن
جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا



کب تک اے ابرِ کرم ترسائے گا
مینہ بھی رحمت کا کبھی برسائے گا

پھل کچھ اے نخلِ وفا تجھ میں نہیں
جو لگائے گا تجھے پچھتائے گا

دوست کا آیا ہی سمجھو اب پیام
آج اگر آیا نہیں کل آئے گا

ذوق سب جاتے رہے جز ذوقِ درد
اک یہ لپکا دیکھئے کب جائے گا

واعظ آتا ہے تو آنے دو اسے
پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا

آئے گا اور ہم کو شرمائے گا مفت
اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا

عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم
ہم پہ موُنہہ آئے گا موُنہہ کی کھائے گا

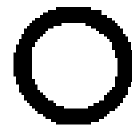
دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف
رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا

باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل
جی قفس میں اس کا کیا گھبرائے گا

رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا
شعبدہ تازہ کوئی دکھلائے گا

ابر و برق آئے ہیں دونو ساتھ ساتھ
دیکھیے برسے گا یا برسائے گا

مشکلوں کی جس کو ہے حالی خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا



وھاں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا
مونہہ اسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

دل میں ہے باقی وہی حرصِ گناہ
پھر کیے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا

آؤ لیں اس کو ہمیں جا کر منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہے انس
ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا

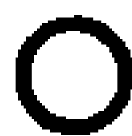
جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی
مرحلے اب دیکھیے پیش آئیں کیا

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا

مان لیجے شیخ جو دعویٰ کرے
اک بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا



کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

کر دیا اس نے تو اللہ سے غافل ناصح
اس کو کیوں بھولتے گر اس کو بھلایا جاتا

چپ چپاتے اسے دے آئے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

شب کو زاہد سے نہ مٹ بھیڑ ہوئی خوب ہوا
نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

دل کو یہ تو نے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے نا
چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو
تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

عشق اس وقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا
گودیوں میں تجھے تھا جب کہ کھلایا جاتا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دنیا
ہم سے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

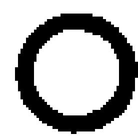
کرتے کیا پیتے اگر مے نہ عشا سے تا صبح
وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غمِ عشق
کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی
کہتے پہلے سے تو دے لے کے ہٹایا جاتا



راحت کا جہاں میں تو نہیں اک نام ہے گویا
راحت کی تلاش اک طمعِ خام ہے گویا

کچھ کرتے ہیں جو یاں وہی انگشت نما ہیں
بدنام ہی دنیا میں نکو نام ہے گویا

ناچیز ہیں وہ کام نہیں جن پہ کچھ الزام
جو کام ہیں ان کا یہی انعام ہے گویا

ہے ختم حل ہو رہی عشرت کے ہیں ساماں
آخر ہوئی رات اور ابھی یاں شام ہے گویا

اٹھا تھا کچھ اول ہی سے یہ درد بری طرح
آغاز ہی الفت کا بس انجام ہے گویا

ادبار بھی دیکھو گے جہاں پاؤ گے اسلام
اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا

جب دیکھیے حالی کو پڑا پایئے بیکار
کرنا اسے باقی یہی اک کام ہے گویا

ق

خلوت میں تری صوفی گر نور صفا ہوتا
تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

تھا آفت جاں اس کا انداز کمانداری
ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی
میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

یہ لطف بناوٹ میں دیکھا نہ سنا قاصد
ان پڑھ تو ہے تو یہ کچھ پڑھتا تو بلا ہوتا

باتوں میں شکایت کی بو آتی ہے الفت کی
گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلا ہوتا

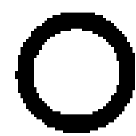
ہم روزِ وداع اس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

گر صاحبِ دل ہوتے سن کر مری بے تابی
تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

جو جان سے در گذرے وہ چاہے سو کر گذرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانئے کیا ہوتا

کل حالیِ دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سنا ہوتا



پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حُسن میزبان، کوئی میہماں نہ تھا

ہم کو بہار میں بھی سرِ گلستاں نہ تھا
یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے جائے گا جی اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط مگر بیمِ جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

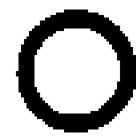
کچھ میری بےخودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جاننا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالیِ جادو بیاں نہ تھا



رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم
شوق تھا بادیہ پیمائی کا

اس سے نادان ہی بن کر ملیے
کچھ اَجارہ نہیں دانائی کا

سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ
حوصلہ کیا ہے تماشائی کا

درمیاں پائے نظر ہے جب تک
ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل
مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا

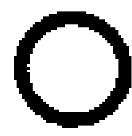
بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں
گل و بلبل کی شناسائی کا

مدد اے جذبۂ توفیق کہ یاں
ہو چکا کام توانائی کا

محتسب عذر بہت ہیں لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا



اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

دردا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا

جانی نہ قدرِ رحمتِ حق پارسا نے کچھ
ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا

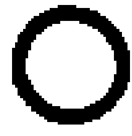
دُردی کشانِ بزمِ مغاں کا نہ پوچھ حال
ایک ایک رند نشۂ وحدت میں چور تھا

اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں
وہ دل کہ خاص محرمِ بزمِ حضور تھا

روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا

بیمار کی تو اپنے نہ لی تم نے کچھ خبر
بہرِ نمازِ نعش پہ آنا ضرور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا



دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست
زنہار بارِ عشق اٹھایا نہ جائے گا

دیکھی ہیں ایسی ان کی بہت مہربانیاں
اب ہم سے مونہہ میں موت کے جایا نہ جائے گا

مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

راضی ہیں ہم کو دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

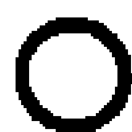
کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا

مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حالیؔ پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا



قلق اور دل میں سوا ہو گیا
دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور
مرا شکر اس کا گلا ہو گیا

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

ہوا رکتے رکتے دمِ آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

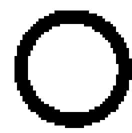
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

سمجھتے تھے جس غم کو ہم جاں گزا
وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا

نہ دے میری امید مجھ کو جواب
رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا



سنگِ گراں ہے راہ میں تمکینِ یار کا
اب دیکھنا ہے زور دلِ بے قرار کا

اک خُوسی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل
کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا

ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

سمجھو مجھے اگر تمہیں ہے آدمی کی قدر
میرا اک التفات نہ مرنا ہزار کا

گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال
سن لیں گے وہ مآل شبِ انتظار کا

اب محو بوئے گل پہ ہوا کب دلِ حزیں
ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

ہر سمت گردِ ناقۂ لیلیٰ بلند ہے
پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا

غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا
خانہ خراب خاطرِ الفت شعار کا

حالیؔ بس اب یقیں ہے کہ دلی کے ہو رہے
ہے ذرہ ذرہ مہر فزا اس دیار کا

ب

دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب
کیمیا کو طلا سے کیا مطلب

چشمۂ زندگی ہے ذکرِ جمیل
خضر و آبِ بقا سے کیا مطلب

بادشاہی ہے نفس کی تسخیر
ظلِ بالِ ہما سے کیا مطلب

جو کریں گے بھریں گے خود واعظ
تم کو میری خطا سے کیا مطلب

جن کے معبود حور و غلماں ہیں
ان کو زاہد خدا سے کیا مطلب

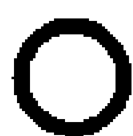
قطعہ

کام ہے مردمی سے انساں کی
زہد یا اتقا سے کیا مطلب

ہے اگر رند دامن آلودہ
ہم کو چون و چرا سے کیا مطلب

صوفیِ شہر با صفا ہے اگر
ہو، ہماری بلا سے کیا مطلب

نکہتِ مے پہ غش ہیں جو حالی
ان کو درد و صفا سے کیا مطلب



مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی مونہہ میں زباں ہے اب

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب

جس دل کو قیدِ ہستیِ دنیا سے ننگ تھا
وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب

آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب

اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب

ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز
ہاں جذبِ دل مدد کہ دمِ امتحاں ہے اب

ہے دل غمِ جہاں سے سبکدوش ان دنوں
سر پڑتا سوجھتا کوئی بارِ گراں ہے اب

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش
وہ علم و دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

پ

یہ ہیں واعظ سب پہ مونہہ آتے ہیں آپ
ناصحِ قوم اس پہ کہلاتے ہیں آپ

بس بہت طعن و ملامت کر چکے
کیوں زباں رندوں کی کھلواتے ہیں آپ

ہے صراحی میں وہی لذت کہ جو
چڑھ کے منبر پر مزا پاتے ہیں آپ

واعظو ہے ان کو شرمانا گناہ
جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں ایک اک کی تکفیر آپ کیوں؟
اس پہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور
خلد کو ویران کرواتے ہیں آپ

چھیڑ کر واعظ کو حالی خلد سے
بسترا کیوں اپنا پھکواتے ہیں آپ

ت

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

زیرِ برقع تو نے کیا دکھلا دیا
جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت

ہٹ پہ اس کی اور پس جاتے ہیں دل
راس ہے کچھ اس کو خودرائی بہت

سرو یا گل آنکھ میں جچتے نہیں
دل پہ ہے نقش اس کی رعنائی بہت

چور تھا زخموں میں اور کہتا تھا خر
راحت اس تکلیف میں پائی بہت

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

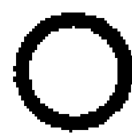
جاں نثاری پر وہ بول اٹھے مری
ہیں فدائی کم تماشائی بہت

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت



اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ہے غم روز جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہوگئی اور ہی کچھ شام وسحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھیے شیخ مصور سے کھچے یا نہ کھچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت

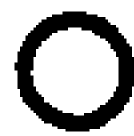
شوق میں اس کے مزا درد میں اس کے لذت
ناصحو اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعدِ ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت



بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
پہ چھپتی نہیں سرگرانی کی صورت

جسے دیکھ کر دل ہو عاشق کا بے کل
وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت

شبِ وعدہ ہے بارِ عام ان کے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

غمِ دل نے رسوا کیا ہم کو آخر
بنائی بہت شادمانی کی صورت

ہے اس ریش پر وسمہ کیا خوب کھلتا
ذرا دیکھنا شیخ فانی کی صورت

یقیں ہے کہ ہم جس کو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت

سمجھ کر کرو قتل حالی کو دیکھو
مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

ٹ

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ
دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ

رچ رہی ہے کان میں یاں لے وہی
اور مغنی نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت
اور دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ

اک کہانی پیرزن کی رہ گئی
راج کسریٰ کا رہا باقی نہ پاٹ

دیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں
ہے مگر یاں جی کچھ اے زاہد اچاٹ

جو کہے تجھ کو بتا دیں اے امیر
ہیں بہت سرکار کی محفل میں بھاٹ

ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر
ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

چٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون
شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

تیغ میں برش یہ اے حالی نہیں
جس قدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ

ث

باپ کا ہے جبھی پسر وارث
ہو ہنر کا بھی اس کے گر وارث

گھر ہنرور کا ناخلف نے لیا
تیرا ہے کون اے ہنر وارث

فاتحہ ہو کہاں سے میت کی
لے گئے ڈھو کے سیم و زر وارث

ہوں اگر ذوقِ کسب سے آگاہ
کریں میراث سے حذر وارث

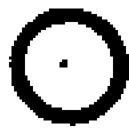
خاک و کرمانِ گور و خویش و تبار
ایک میت اور اس قدر وارث

واعظو دین کا خدا حافظ
انبیاء کے ہو تم اگر وارث

قوم بے پَر ہے دین بے کس ہے
گئے اسلام کے کدھر وارث

ہم پہ بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے حریف
جیسے مردہ کے مال پر وارث

ترکہ چھوڑا ہے کچھ اگر حالی
کیوں ہیں میت پہ نوحہ گر وارث



بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث
دل جلوں کو تو نے گرمایا عبث

جلوہ صوفی نے نہ دکھلایا کوئی
رات بھر یاروں کو ترسایا عبث

شیخ! رندوں میں بھی ہیں کچھ پاک باز
سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث

کوئی پنچھی آ کے اب پھنستا نہیں
آپ نے جال اپنا پھیلایا عبث

آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم
تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

کھیتیاں جل کر ہوئیں یاروں کی خاک
ابر ہے گھر کر ادھر آیا عبث

قوم کا حالی پنپنا ہے محال
تم نے رو رو سب کو رلوایا عبث

ج

بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج
بول کر ہم نے موںہہ کی کھائی آج

چپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ
بات بگڑی بنی بنائی آج

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

بزم ساقی نے دی الٹ ساری
خوب بھر بھر کے خم لنڈھائی آج

قطعہ

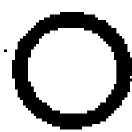
معصیت پر ہے دیر سے یارب
نفس اور شرع میں لڑائی آج

غالب آتا ہے نفسِ دُوں یا شُرع
دیکھنی ہے تری خدائی آج

چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو
نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

کل یہاں کاروبار ہیں سب بند
کر لو کرنی ہے جو کمائی آج

زد سے الفت کی بچ کے چلنا تھا
مفت حالی نے چوٹ کھائی آج



تلخیِ دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج
یہ بھی ہے یارو کوئی رنجوں میں رنج

رنج و شادی یاں کے ہیں سب بے ثبات
اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج

تھا قناعت میں نہاں گنجِ فراغ
پر ہمیں بے وقت ہاتھ آیا یہ گنج

فکرو بن بڑھتے ہیں شاید ساتھ ساتھ
ہیں وہ اب پنجاہ جو پہلے تھے پنج

ہم کو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا
جب کبھی جیتے تھے ہم اے بذلہ سنج

آ گئی مرگِ طبیعی ہم کو یاد
شاخ سے دیکھا جو خود گرتا ترنج

راہ اب سیدھی ہے جاں سوئے دوست
ہو چکے طے سب خم و پیچ و شکنج

چ

بزمِ مے اچھی ہے گو دنیا ہے اے مے خوار ہیچ
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ

نفس سے سر بر ہوئی دانش نہ صبر و عقل و ہوش
ایک دشمن برسرِ کیں ہو تو ہیں سب یار ہیچ

شیخ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز
ہے یہ سب اونچی دکاں اور رونقِ بازار ہیچ

شاہدِ معنی کو آرائش کی کچھ حاجت نہیں
سُبحہ و سجادہ ہیچ اور جُبّہ و دستار ہیچ

ہو گر جتے جس قدر اتنے برستے تم نہیں
اے فصیحو! ہے یہ سب گفتارِ بے کردار ہیچ

روئی تو آٹھ آٹھ آنسو اور پسیجا دل نہ ایک
نکلے موتی تیرے سب اے چشمِ گوہر بار ہیچ

خوانِ نعمت نے ترے اے عالِمِ مردار خوار
کر دیئے آفاق کے سب خوانِ دخواں سالار ہیچ

ہے ادب مسند پہ جو کچھ ہے رئیسِ شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

ح

کاٹیے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

منزلِ دنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح

سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو
ہیں اسے پانی دیے جاتے کسانوں کی طرح

ان کے غصے میں ہے دلسوزی ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

کام سے کام اپنے ان کو گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

کچھ کیا حالی نہ کچھ سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

خ

مئے مغاں کا ہے چسکا اگر برا اے شیخ
تو ایسی ہی کوئی چاٹ اور دے لگا اے شیخ

ریا کو صدق سے ہے جامِ مے بدل دیتا
تمہیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ

وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر
تماشے دیکھے ہیں یہ ہم نے بارہا اے شیخ

غرورِ فقر و غرورِ غنا میں فرق ہے کیا
تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ

زباں پہ ہوتی ہے مہر ان کی جو ہیں محرمِ راز
پھر ایسا کیجو نہ ہرگز نہ ادعا اے شیخ

خبر بھی ہے تمہیں؟ کیا بن رہی ہے بیڑے پر
ہیں آپ جون سے بیڑے کے ناخدا اے شیخ

وہ ڈوبتوں سے الگ رہتے ہیں جو ہیں تیراک
شناوری کا یہی گر ہے مرحبا اے شیخ

گو زن و گور ہیں بچپن سے تارکِ دنیا
نہایت آپ کی ہے ان کی ابتدا اے شیخ

کمالِ حسنِ عقیدت سے آیا تھا حالی
پہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

د

شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد
اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا رجا کے بعد

ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور
ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

تعزیرِ جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

گر دردِ دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

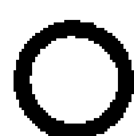
یادِ خدا میں جب نہ گئی دل سے اس کی یاد
آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم
ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

آخر کو ماننا پڑا اے نفسِ خیرہ سر
تیرا بھی حکم کم نہیں حکمِ قضا کے بعد

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر
بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد



کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد
تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہد

درگزر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے
تو ترا اور کوئی ہو گا خدا اے زاہد

ہم دکھا دیں گے کہ زہد اور ہے نیکی کچھ اور
کچھ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہد

قربِ حق کے لیے کچھ سوزِ نہاں بھی ہے ضرور
خشک نفلوں میں دھرا کیا ہے بھلا اے زاہد

میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تم سے
تو ہی کہہ اس میں ہے کیا میری خطا اے زاہد

جال جب تک ہے یہ پھیلا ہوا دینداری کا
فکر دنیا کا کرے تیری بلا اے زاہد

عیب حالی کے بہت آج کیے تو نے بیاں
ذکر کچھ اور کر اَب اس کے سوا اے زاہد

ذ

پیاس تیری بوئے ساغر سے لذیذ
بلکہ جامِ آبِ کوثر سے لذیذ

جس کا تو قاتل ہو پھر اس کے لیے
کون سی نعمت ہے خنجر سے لذیذ

لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب
ہم کو ہے سب شہد و شکر سے لذیذ

قند سے شیریں تری پہلی نگاہ
دوسری قندِ مکرّر سے لذیذ

جھانجھ میں جس بھوک کی بھولے نہ تو
بھوک ہے وہ شیرِ مادر سے لذیذ

ہے یہ تجھ میں کس کی بُو باس اے صبا
بوئے بید و مشک و عنبر سے لذیذ

جو قناعت کے ہیں حالی میہماں
ان کو فاقے ہیں مزعفر سے لذیذ

ر

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر
وہی اصرار ہے خطاؤں پر

رہیں نا آشنا زمانہ سے
حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر

رہرو و باخبر رہو کہ گماں
رہزنی کا ہے رہنماؤں پر

ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہے کیا
مرتے ہیں ہم انہیں اداؤں پر

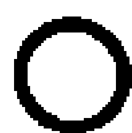
اس کے کوچہ میں ہیں وہ بے پر و بال
اڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر

شہسواروں پہ بند ہے جو راہ
وقف ہے یاں برہنہ پاؤں پر

نہیں منعم کو اس کی بوند نصیب
مینہ برستا ہے جو گداؤں پر

نہیں محدود بخششیں تیری
زاہدوں پر نہ پارساؤں پر

حق سے درخواست عفو کی حالی
کیجیے کس مونہہ سے ان خطاؤں پر



کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار
عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر

دوست اس کے ہیں نہ اس کے آشنا
گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر

خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیرِ نر

اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں
کرتے ہیں نفرت بدی سے جس قدر

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رسوا اسے دل کھول کر

کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے ہیں اس سے خواہاں عمر بھر

ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر

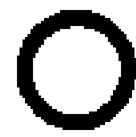
عیب کچھ گنتے نہیں اس عیب کو
جس سے ہوں اپنے سوا سب بے خبر

خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں
کھینچ کر لاتے ہیں اس کو سوئے شر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تا کہ ہو
عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر

دوست اک عالم کے پر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر یارو حذر

عیب حالی اپنے یوں کہتا ہے کون
خواہشِ تحسیں ہے حضرت کو مگر



ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر
دام اٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کیے بغیر

گو ہو شفا سے یاس پہ جب تک ہے دم میں دم
بن آئے گی نہ درد کا درماں کیے بغیر

بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا
یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کیے بغیر

آمادہ دہر پردہ دری پر ہے قوم کی
مبروص کو رہے گا نہ عریاں کیے بغیر

عزت سے اپنی یاروں کو کچھ آپڑی ہے ضد
چھوڑیں گے نیم جاں کو نہ بے جاں کیے بغیر

مشکل بہت ہے گو کہ مٹانا سلف کا نام
مشکل کو ہم ٹلیں گے نہ آساں کیے بغیر

گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دل ربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کیے بغیر

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی
چھوڑے گا وقت انہیں نہ مسلماں کیے بغیر

حالی کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بے ستوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کیے بغیر

ڑ

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اجاڑ
ہو گئی ایک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

آج تک قصرِ اَمَل ہے ناتمام
بندہ چکی ہے بارہا کھل کھل کے پاڑ

ہے پہنچنا اپنا چوٹی تک محال
اے طلب نکلا بہت اونچا پہاڑ

کھیلنا آتا ہے ہم کو بھی شکار
پر نہیں زاہد کوئی ٹٹی کی آڑ

دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے
سو شبستاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ

عید اور نو روز ہے سب دل کے ساتھ
دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اجاڑ

کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار
کشت ہے سرسبز اور نیچی ہے باڑ

بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی
ان دنوں کمتر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

تم نے حالی کھول کر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

ز

عہدِ وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز
عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز

پیغام دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز
جھوکا نسیمِ مصر کا آیا نہیں ہنوز

لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں
ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز

آیا نہ ہوگا اس کو تغافل میں کچھ مزا
ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز

ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا
اس نے نقاب رخ سے اٹھایا نہیں ہنوز

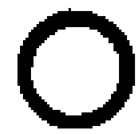
یاں دے چکی جواب امیدِ جوابِ خط
وھاں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز

پایا ہے ذوق و شوق میں ہم کو بھرا ہوا
کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز

کیا دل سے بعدِ مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد
بھولے ہمیں کہ تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز

سرمایۂ خلافِ دو عالم ہے رازِ دل
باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز

کس نشہ میں ہے چور خدا جانے اس قدر
حالی نے جام مونہہ سے لگایا نہیں ہنوز



جیتے جی موت کے تم موُنہہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی
دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی
زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز

چاہت اک طلعتِ مکروہ ہے برقع میں نہاں
کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے
نوجوانی میں نہ یہ روگ لگانا ہرگز

جتنے رَمنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی، مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہو گا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہو گی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

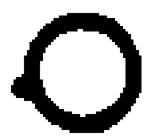
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز



رنجش و التفات و ناز و نیاز
ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

عشق کی آنچ اس میں پاتا ہوں
دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز

شیخ! اللہ رے تیری عیاری
کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

اک پتے کی جو ہم نے کہہ دی آج
رنگ واعظ کا کر گیا پرواز

ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری
تو گئی بھول ہم کو خاکِ حجاز

آج منکر بھی ناچ اٹھیں گے
گر مغنی کی ہے یہی آواز

قطعہ

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف
چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا
ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز

ہوتے جاتے ہیں زور مند ضعیف
بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز

چھپتے پھرتے ہیں کبک دیہو سے
گھونسلوں میں عقاب اور شہباز

ہے نہتوں کو رہگزر میں خطر
رہزنوں نے کیے ہیں ہاتھ دراز

ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم
بھیڑیوں کے ہیں خوں میں ترلبِ آز

ناتوانوں پہ گدھ ہیں منڈلاتے
گھائلوں پر ہیں ہیز تیر انداز

تشنۂ خوں ہیں بھوکے شیروں کے
حیلہ گر رو بہوں کے عشوہ و ناز

دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس
اور یاروں کے یار ہیں غماز

ہو گا انجام دیکھیے کیا کچھ
ہے پر آشوب جبکہ یہ آغاز

لے ابھی تک کھلی نہیں لیکن
غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر
موج ہائل ہے اور ہوا ناساز

یا تھپیڑے ہوا کے لے ابھرے
یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز

کام اسے اپنے سونپ دو حالی
نہیں جس کا شریک اور انباز

ہے وہ مالک ڈبوئے خواہ ترائے
چارہ یاں کیا ہے غیرِ عجز و نیاز

س

جذبِ رحمت ہے مقناطیسِ عصیاں اپنے پاس
رکھتے ہیں عاصی کمندِ صیدِ غفراں اپنے پاس

عاجزوں نے مقتدر کر لئے ہیں اکثر درگزر
عجز اپنا ہے کلیدِ بابِ رضواں اپنے پاس

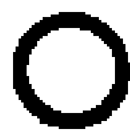
ہو گئی گر کچھ سمجھنے میں خطا فرمان کے
عذر خواہ اپنا ہے خود فرمانِ سلطاں اپنے پاس

بام بتلایا بلند اور نارسا بخشی کمند
رکھتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ برہاں اپنے پاس

خاک میں ہم نے ملا رکھی ہے اکسیر اپنی آپ
ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس

دستِ بُردِ اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں
ہے بحمد اللہ وہ مہرِ سلیماں اپنے پاس

دیکھنا حالی نہ دینا وضعِ فطرت کو بدل
ہے یہ دستاویزِ استخلافِ رحماں اپنے پاس



چھیڑ اب نہ اے تصورِ مژگانِ یار بس
کافی ہے خار خارِ غمِ روزگار بس

یہ غم نہیں ہے وہ جسے کوئی بٹا سکے
غمخواری اپنی رہنے دے اے غمگسار بس

ہر داغ فصلِ گل کی نشانی ہے اے صبا
گلگشت کو بہت ہے دلِ داغدار بس

ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں
اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس

دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ
یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس

آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر
کی نیند کیوں حرام بس اے انتظار بس

تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

ش

اک ہم کو مہم برسرِ ایام ہے درپیش
بنتا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش

غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہے چار طرف سے
اور معرکۂ گردشِ ایام ہے در پیش

وہ دن گئے جب تھا مرضِ صعب کا آغاز
اب اس مرضِ صعب کا انجام ہے درپیش

گو صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی قیامت
پر صبح تو جوں توں گئی اب شام ہے درپیش

وہ وقت گیا نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا
اب وقت خمارِ مئے گلفام ہے درپیش

امیدِ شفا کا تو جواب آ ہی چکا ہے
اب موت کا سننا ہمیں پیغام ہے درپیش

جی اس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے درپیش

ص

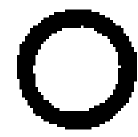
ہر بشر سے اس کی مختص ہیں عطائیں خاص خاص
ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص

دل تو اپنا پھر چکا ہے زالِ دنیا سے مگر
رہزنِ دل میں ابھی اس کی ادائیں خاص خاص

گو زمانہ نے بھلا دی دل سے اپنے فصلِ گل
یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص

زہد و تقویٰ سے نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
وقت میں کچھ خاص خاص اور ہیں ادائیں خاص خاص

یوں تو ہے امید سب کچھ پر نہ ہوں شاید معاف
وہ جو کی ہیں ہم نے اے حالی خطائیں خاص خاص



درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلّاد و مسیحا بخُدا ایک ہی شخص

حور و غلماں کے لیے لائیں دل آخر کس کا
ہونے دیتا نہیں یاں عہدہ برآ ایک ہی شخص

قافلے گزریں وہاں کیونکہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص

گھر میں برکت ہے مگر فیض نہ ہے جاری شب و روز
کچھ سہی شیخ مگر ہے بخُدا ایک ہی شخص

اعتراضوں کا زمانہ کے ہے حالیؔ پہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

ض

عشق کو ترکِ جنوں سے کیا غرض
چرخِ گرداں کو سکوں سے کیا غرض

دل میں ہے اے خضر گر صدقِ طلب
راہ رو کو رہنموں سے کیا غرض

حاجیو ہے ہم کو گھر والے سے کام
گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض

گنگنا کر آپ رو پڑتے ہیں جو
ان کو چنگ و ارغنوں سے کیا غرض

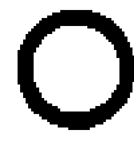
نیک کہنا نیک جس کو دیکھنا
ہم کو تفتیشِ دروں سے کیا غرض

دوست ہیں جب زخمِ دل سے بے خبر
ان کو اپنے اشکِ خوں سے کیا غرض

عشق سے ہے مجتنب زاہد عبث
شیر کو صیدِ زبوں سے کیا غرض

کر چکا جب شیخ تسخیرِ قلوب
اب اسے دنیائے دُوں سے کیا غرض

آئے ہو حالیؔ پئے تسلیم یاں
آپ کو چون و چگوں سے کیا غرض



دوست کا ناروا نہیں اعراض
دوستوں ہی کا کام ہے اغماض

چاہیے ایک سب کا ہو مقصود
گو ہوں سب کی جدا جدا اغراض

یاد میں تیری سب کو بھول گئے
کھو دیئے ایک دکھ نے سب امراض

دیکھیے تو بھی خوش ہے یا ناخوش
اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض

لَا اُبَالِی بِاَنْ یُعَاتِبَنِی
کُلُّ نَاسٍ وَاَنْتَ عَنِّیْ رَاضٍ

مُنعمو بُخلِ خیر تس یہ دیر
اپنا مطلب اور اُس پہ سو اغماض

حق میں اپنوں کے سخت ممسک ہیں
جو کہ اوروں کے حق میں ہیں فیاض

رائی ہے کچھ علیل سی تیری
نبض اپنی بھی دیکھ اے نبّاض

وعظ میں گل کترتے ہیں واعظ
مونہ میں ان کے زباں ہے یا مقراض

ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع
ہَل لَنَا فِی نِزَا عِنَا مِن قَاض

ہے ریاضت پہ ناز کیا زاہد
خار کش تجھ سے ہے سوا مرتاض

شیخ کی تھی یہ آخری تلقین
چاہیے زر تو اس سے کر اعراض

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

ط

رات گزری ہو چکا دورِ نشاط
طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط

دل سے خوشیاں ہو گئیں سب گوشہ گیر
نام تھا شاید جوانی کا نشاط

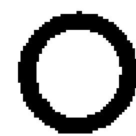
دن اب اے دل منقبض رہنے کے ہیں
ہو چکا ہونا تھا جو کچھ انبساط

غنچہ چٹکا اور آ پہنچی خزاں
فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط

زینۂ منبر ہے لغزش کی جگہ
جانیو واعظ اسے راہِ صراط

تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ
ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط

کوچ کی حالی کرو تیاریاں
ہے قویٰ میں دم بدم اب انحطاط



چھپے ہیں حریفوں میں احرار واعظ
برا کہہ نہ رندوں کو زنہار واعظ

سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر
نہ ستار ہے تو نہ غفار واعظ

نکل آئے گی مے کشی کی بھی علت
کوئی مل گیا گر ہمیں یار واعظ

کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن
سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ

ہمیں اور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن
یہ جبہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ

نہ چھوڑے گا زیور گھروں میں نہ زر تو
یہی ہے اگر حسنِ گفتار واعظ

مسلماں نہ ہم کاش حالی کو کہتے
ہوئے بات کہہ کر گنہگار واعظ

ع

اے بہارِ زندگانی الوداع
اے شباب اے شادمانی الوداع

اے بیاضِ صبحِ پیری السلام
اے شبِ قدرِ جوانی الوداع

السلام اے قاصدِ ملکِ بقا
الوداع اے عمرِ فانی الوداع

روزگارِ ضعف و سستی الصلا
وقتِ سعی و جانفشانی الوداع

قطعہ

فرصتِ عشق و جوانی الفراق
دورِ عیش و کامرانی الوداع

تجھ کو سمجھے تھے نعیمِ جاوداں
اے نعیمِ جاودانی الوداع

تیرے، جاتے ہی گئیں سب خوبیاں
اے خدا کی مہربانی الوداع

آ لگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

غ

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ
دیکھ اس خرامِ ناز پہ اتنا نہ کر دماغ

ہے تاک میں عقاب تو شہباز گھات میں
حملے سے یاں اجل کے نہیں ایک دم فراغ

یا رب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو
بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ

دو چار گام نقشِ قدم مل کے رہ گئے
آگے چلا نہ آہوئے مشکیں کا کچھ سراغ

آئیں پئیں وہ شوق سے جو اہلِ ظرف ہوں
ساقی بھرے کھڑا ہے مے لعل سے ایاغ

جنگل میں تختۂ گلِ خود رُو کو دیکھ کر
تازہ ہوا زمانہ کی ناقدریوں کا داغ

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزمِ شعر میں
باری تب ان کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

ف

حق نہ مُلّا نے کچھ بتایا صاف
اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف

آنکھ اپنی ہی جب تلک نہ کھلی
مہرِ روشن نظر نہ آیا صاف

کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم
صاف تھے آپ سب کو پایا صاف

زاہدو ہم تو تھے ہی آلودہ
تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف

کیوں فقیہوں سے رک گئے حالی
بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف

ق

نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لایق
نہ اپنا کلبۂ احزاں ہے یار کے لایق

کرے گا کیا ترا کحل الجواہر اے کُحال
نہیں یہ آنکھ ہی دیدارِ یار کے لایق

مکان عاریتی اور لباس بوسیدہ
بہت ہے زندگیِ مستعار کے لایق

غرور و حرص ہیں زیور عروسِ دنیا کے
بناؤ تھے یہی اس نابکار کے لایق

کرے گی بادِ بہار آ کے اب کسے سرسبز
رہا نہ باغ قدومِ بہار کے لایق

بس اب ہے فضلۂ روباہ و گرگ پر گزران
رہا نہ شیرِ ژیاں خود شکار کے لایق

گنہ کا عذر کریں محتسب ہم آنکھوں سے
ہمارے جرم ہوں گر اعتذار کے لایق

یہ ہم نے مانا کہ تم میں ہنر بھی ہیں کچھ کچھ
مگر نہیں کوئی خوبی شمار کے لایق

گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالی
تمہیں تو شہر میں ہو اعتبار کے لایق

ک

دلوں کا کھوٹ اگر کہیے برملا ایک ایک
تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رُو بیٹھیں
جہاں ہے راہزنِ خَلق رہنما ایک ایک

زمانہ پھر نظر آتا ہے کچھ ترقی پر
بنا ہے غوثِ زماں آج کل گدا ایک ایک

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہے رندو پارسا ایک ایک

وفا کی ایک تجھی سے امید ہے اس وقت
کہ یار یار سے ہو جائے گا جدا ایک ایک

چھپا کے اس سے قصور اپنے ہم بہت شرمائے
جب آپ موںہہ سے لگی بولنے خطا ایک ایک

ہوا نہ ایک بھی حق اس کی بندگی کا ادا
کیا ہے جس نے حقِ خواجگی ادا ایک ایک

امیرِ حاج کی ہمت میں گر نہ آئے قصور
تو موجِ بحر ہے کشتی کی ناخدا ایک ایک

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک

بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ
جگر کے پار ہے اب بھی تری نوا ایک ایک

وہ عشق ہے نہ جوانی وہ تو ہے اب نہ وہ ہم
پہ دل پہ نقش ہے اب تک تری ادا ایک ایک

نہ ہم رہیں گے نہ حالی پہ دلخراش جہاں
رہے گی حالیِ دلگیر کی صدا ایک ایک

گ

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمین ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

دوست کے ہیں جاں نثار اپنا ہو یا بیگانہ ہو
ہے عشیرہ اور ان کا دودماں سب سے الگ

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور انکا رازداں سب سے الگ

جانچتے اوروں کو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں
رکھتے ہیں اپنا طریقِ امتحاں سب سے الگ

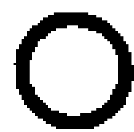
اک چمن بہرِ تفرّج رکھتے ہیں زیرِ بغل
روضہ و بستان و فردوس و جناں سب سے الگ

کلبۂ احزاں ہے روشن انکا جس مہتاب سے
ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ

سیکڑوں پھندوں میں یاں جکڑا ہوا ہے بند بند
پر ٹٹولے کوئی دل اُنکا تو واں سب سے الگ

شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے
دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ



صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

عہدِ گیتی پر نہ پھولیں کامراں
آخر اس کی آشتی لائے گی رنگ

علم کیا اخلاق کیا ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ

روکیے بدخو کو بدخوئی سے کیوں
آپ اپنی خو سے آ جائے گا تنگ

زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ
یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ

پاکبازوں کو نہیں کچھ قیدِ وضع
جو ہیں اچھے ان پہ سب کھلتے ہیں رنگ

کام کا شاید زمانہ ہو چکا
دل میں اب اٹھتی نہیں کوئی امنگ

وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل
دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ

کاہشوں سے پرورش پاتی ہے روح
اب لگا کھایا پیا سب آ کے انگ

عقل شاید ملک میں باقی ہے کچھ
ہے ابھی کم حاصلِ افیون و بنگ

بڑھ گیا ہے رحمِ انسانی بہت
ہو گی ایجاد اب نئی توپ و تفنگ

قوم کو حالی نہیں راس اتفاق
پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

ل

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل
یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل

رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثارِ سلف
اور ابھی ہونا ہے شاید مبتذل

اک سنبھلتے ہم نظر آتے نہیں
ورنہ گر گر کر گئے لاکھوں سنبھل

کب تک آخر ٹھیر سکتا ہے وہ گھر
آ گیا بنیاد میں جس کی خلل

ناؤ ڈوبے یا کہیں کھیوا ہو پار
تیری حد بھی ہے کچھ اے طولِ امل

اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی
لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل

دیکھیے نبھتا ہے کب تک پاسِ وضع
ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل

کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں
وقت کوشش کا گیا شاید نکل

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

م

مدرسہ میں دہر کے روبر قفا بیٹھے تھے ہم
اٹھے بس ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم

پھر وہی ہم ہیں کہ ہر عشوہ پہ ہیں کافر کے لوٹ
زالِ دنیا سے ابھی ہو کر خفا بیٹھے تھے ہم

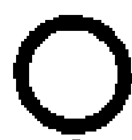
صحبتیں اہلِ ورع کی سب گئیں نظروں سے گر
بزمِ رنداں میں یوں ہی اک روز جا بیٹھے تھے ہم

شیخِ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی
ورنہ دھوکا دور سے دیکھ اس کو کھا بیٹھے تھے ہم

ہم نہ تھے آگاہ واعظ زشت خوئی سے تری
آدمی تجھ کو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم

سعی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر
ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اٹھا بیٹھے تھے ہم

ہم سے خود دنیا ہی چھپائی نہ حالی ورنہ یاں
دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم



خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں
گو کہ دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے نہیں
پر گنہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم

دیدہ و دل کو خیانت سے نہیں رکھ سکتے باز
گرچہ دست و پا کو اکثر بے خطا پاتے ہیں ہم

دل میں دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر
پر اسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم

ہو کے نادم جرم سے پھر جرم کرتے ہیں وہی
جرم سے گو آپ کو نادم سدا پاتے ہیں ہم

ہیں فدا ان دوستوں پر جن میں ہو صدق و صفا
پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم

گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا
اک جہاں سے آپ کو لیکن خفا پاتے ہیں ہم

جانتے اپنے سوا سب کو ہیں بے مہر و وفا
اپنے میں گر شمۂ مہر و وفا پاتے ہیں ہم

بُخل سے منسوب کرتے ہیں زمانہ کو سدا
گر کبھی توفیقِ ایثار و عطا پاتے ہیں ہم

ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر سکتے ہیں صبر
دردِ خودکامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم

ٹھیرتے جاتے ہیں جتنے چشمِ عالم میں بھلے
حال نفسِ دُوں کا اتنا ہی برا پاتے ہیں ہم

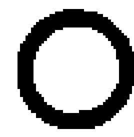
جس قدر جھک جھک کے ملتے ہیں بزرگ و خرد سے
کبر و ناز اتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم

گو بھلائی کر کے ہم جنسوں سے خوش ہوتا ہے جی
تہ نشیں اس میں مگر دردِ ریا پاتے ہیں ہم

ہے ردائے نیک نامی دوش پر اپنے مگر
داغ رسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہیں ہم

راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہیں قدم
دیکھیے کیا ڈھونڈھتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم

نور کے ہم نے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری الاپوں میں نیا پاتے ہیں ہم



آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم

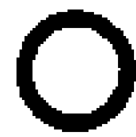
لینے دو چین کوئی دم اے منکرو نکیر
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم

دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھئے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالیِ جادو بیاں سے ہم



یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

یاد اس کی دل سے دھو دے اے چشمِ تر تو مانوں
اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں

بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

غیبت ہو یا حضوری دونو بری ہیں تیری
جب بدگمانیاں تھیں اب بدزبانیاں ہیں

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

رحمت تری غذا ہے غصہ ترا دوا ہے
شانیں ہیں تیری جتنی جانِ جہانیاں ہیں

ہو گا تو پہلے ہو گا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
حصہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں

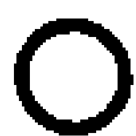
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آتی آگے گرانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں



جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوئے کان ہمیں

کچھ روزوں غفلت میں پھرے یاں ڈھونڈتے ہم آسائش کو
کھل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلجان ہمیں

چل کے نئی اک چال فلک نے کھو دیئے ہوش حریفوں کے
زد سے بچیں یا مات قبولیں اتنے نہیں اوسان ہمیں

پاس انہیں گر اپنا ذرا ہو جاں اپنی بھی ان پہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

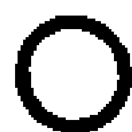
دادِ طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اسکو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں

یاں تو بدولت زہد و وَرَع کے نبھ گئی خاصی عزت سے
بن نہ پڑا پر کل کے لیے جو کرنا تھا سامان ہمیں

سر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالی یاں سمجھو تم مہمان ہمیں



کی تو ہیں ہم نے بھی حالیؔ کوچ کی تیاریاں
سوجھتی ہیں راہ میں لیکن بہت دشواریاں

خوابِ راحت میں وہ لذت تیرے اے پیری نہیں
جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

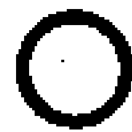
ہیں اگر بیدردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار
ناگوار ان سے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں

ہے کہیں اقبال کی نوبت کہیں ادبار کی
سب کو کرنی ہوں گی پوری اپنی اپنی باریاں

زیست بے عقلوں کو ہو جائے بسر کرنی محال
اتنی بھی اے عاقلو اچھی نہیں ہشیاریاں

بے مزہ ہے اہلِ دیں کی ترشروئی بھی مگر
اس سے پھیکی اہلِ دنیا کی ہیں ظاہر داریاں

گو طبیعت سے گئے سب مادے فاسد نکل
کم ہوئیں حالی نہ لیکن نفس کی بیماریاں



رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں
آج ہم شہر میں خونِ اپنا ہدر کرتے ہیں

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید
جنتی جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں

جرمِ خالق سے سوا پاتے ہیں جرمِ فقہا
جب کہ ہم اپنے جرائم پہ نظر کرتے ہیں

کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ
بول قوال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں

زہد و طاعت کا سہارا نہیں جب سے زاہد
یاد اللہ کو ہم آٹھ پہر کرتے ہیں

عیب یہ ہے کہ کرو عیبِ ہنر دکھلاؤ
ورنہ یاں عیب تو سب فرد بشر کرتے ہیں

غمزدو رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دکھاتے ہیں وہی جس میں کہ گھر کرتے ہیں

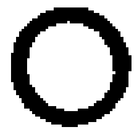
جی رکاوٹ سے جوان کی کبھی رک جاتا ہے
اک لگاوٹ میں ادھر سے وہ ادھر کرتے ہیں

ایک یاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

تلخیاں زیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی
یہ مہم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں

قیصرو زار کا یاں پیٹ تو بھرنا معلوم
بس ہماری ہی طرح وہ بھی گزر کرتے ہیں

کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی
آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں



دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سیکڑوں اِس میں

کی نصیحت بری طرح ناصح
اور اک بس ملا دیا بس میں

ہو نہ بینا تو فرق. پھر کیا ہے
چشم انسان و چشم نرگس میں

بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں

دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اِس میں

نہ ہو قبضے میں جب عنانِ فَرَس
ہیچ ہیں جو ہنر ہیں فارس میں

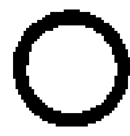
جس سے نفرت ہے اہلِ نعمت کو
وہی نعمت ہے چشمِ مفلس میں

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں
درد تھوڑا بہت نہ ہو جِس میں

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قِسمیں

آج کل چرخِ فتنہ جُو ہے بہت
دیکھیے ہو بگاڑ کِس کِس میں

کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں



بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں
ہیں مئے ناب کے دلاّل قدح خوار نہیں

شہر میں ان کے نہیں جنسِ وفا کی بکری
بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے پہ خریدار نہیں

کون سے وہ گُلِ رعنا پہ نواسنج نہیں
کون سی نرگسِ شہلا کے وہ بیمار نہیں

کبھی لیلیٰ پہ ہیں مفتوں کبھی شیریں پہ فدا
اور جو پھر دیکھو تو دونو سے سروکار نہیں

اٹھ نہیں سکتی سزا جرمِ وفا کی ان سے
دل پھنسا کر کہیں بنتے وہ گنہگار نہیں

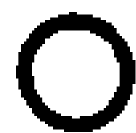
عیش میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ
اور جو ہو کیل کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں

نت نیا ذائقہ چکھنے کا ہے لپکا ان کو
دربدر جھانکتے پھرنے سے انہیں عار نہیں

بوالہوس کام طلب بندۂ نفس اہل ہوئے
ایک عالم ہے اسی رنگ میں، دو چار نہیں

دعوے عشق و محبت پہ نہ جانا ان کے
ان میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

کہے حالی بھی اگر عاشقِ صادق ہوں میں
کہہ دو واللہ کہ صادق نہیں زنہار نہیں



پھونکا ہے فصلِ گل نے صُور آ کے پھر چمن میں
اک حشر سا ہے برپا مرغانِ نغمہ زن میں

بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے
بجلی گری فلک سے یا گُل کِھلا چمن میں

بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا
پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں

چپ ہے زبانِ سوسن حیراں ہے چشمِ نرگس
قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں

ہیں اور تو ادائیں ساری تنک قدوں کی
پڑنی ہے جان باقی بس سروِ ناروَن میں

ہے عیدِ اہلِ اسلام یا موسمِ بہاراں
جنگل بسا ہوا ہے سب عطرِ یاسمن میں

مونہہ سے دھواں سا اٹھا لیتے ہی نامِ اسلام
بارود بچھ رہی تھی گویا لب و دہن میں

پھر زخم پھوٹ نکلا حالی نہ چھیڑنا تھا
فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں

گو رو چکے ہیں دکھڑا سو بار قوم کا ہم
پر تازگی وہی ہے اس قصۂ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
تم نے سنا بھی؟ اس پر کیا گزری انجمن میں

پائیں بزم بھی اب ملتی نہیں اسے جا
روندن میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں

روبہ کی جون میں ہے مرعوب اب وہ ملت
تھی سہمناک کل تک جو شیر کے بُرن میں

وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستند یمن کی
ہے اب بجائے حکمت خاک اڑ رہی یمن میں

قبرِ اویس پر ہے بس فخر اب قَرَن کو
زندہ اُویس کوئی باقی نہیں قَرَن میں

اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اڑا دی
فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں

ڈالی نہ ہو گی آگے اے دورِ چرخ شاید
جواَب کے تو نے ہل چل ڈالی ہے انجمن میں

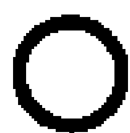
فوج اور بھیر دونو پھرتی ہیں بے سری سی
گویا امیرِ لشکر مارا گیا ہے رَن میں

خُرد و بزرگ سارے ہیں بدحواس گویا
لٹنے کی قافلہ کے پہنچی خبر وطن میں

بھولی ہوئی ہیں ڈاریں ہرنوں کی چوکڑی سب
جائیں کدھر کہ ہر سو دُوں لگ رہی ہے بن میں

حالی بس اب نہیں یاں سننے کی تاب باقی
مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہے یہ پیکاں یا ہے زباں دہن میں



ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اولِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

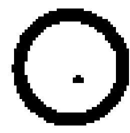
بس ہو چکا بیاں کَسَل و رنجِ راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں



پیا ہم نے نہ جامِ بے کدورت بزم دوراں میں
خزاں کو لے گئے ہمراہ گر پہنچے گلستاں میں

نہیں کچھ منحصر دل بستگی زلفِ پریشاں میں
جو دل چاہے تو الجھے اک غبارِ دود پیچاں میں

اگر چھوڑا کمندِ جذبۂ عشقِ زلیخا نے
نہ رہنے دے گا حسنِ خود نما یوسف کو کنعاں میں

تصور نے بھلایا تیرے ذوقِ شادی و غم کو
نہ کچھ کلفت ہے زنداں میں نہ کچھ راحت شبستاں میں

خوشی میں بھی نہیں رہنا خوش آتا ایک حالت پر
کہاں تک جی نہ گھبرائے الٰہی دردِ ہجراں میں

زباں تقریر سے قاصر قلم تحریر سے عاجز
نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہے ہم نے بزمِ رنداں میں

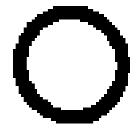
فلک سے جیتے جی معلوم ملنا کام دل اے خضر
سوائے طولِ حسرت کیا دھرا ہے آبِ حیواں میں

نہ چھوڑے گی محبت یار سے ناکام عاشق کو
نسیمِ مصر کو آتا ہے اک دن بیتِ احزاں میں

گل و نسریں تو کیا فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا ہے
ہمارا بھی کبھی لگتا تھا دل سیرِ گلستاں میں

بہت دن چاہئیں یوسف کو تا پہنچے زلیخا تک
نکل کر چاہِ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زنداں میں

نہ دی حیرت نے حالی فرصتِ سیرِ جہاں اک دم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں



اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں

مجھ کو تم سے پر اعتماد وفا
تم کو مجھ سے پر التفات نہیں

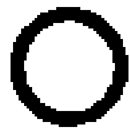
رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں

یونہی گزرے تو سہل ہے لیکن
فرصت غم کو بھی ثبات نہیں

کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں
سرسری دل کی واردات نہیں

ذرہ ذرہ ہے مظہرِ خورشید
جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں



کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال
اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

ہم نے کی سیرِ چمن غور سے اے بلبلِ زار
بات چبھتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

عشق نے مصر میں سو بار زلیخا سے کہا
فتنۂ دہر ہے جو حسن وہ کنعاں میں نہیں

محتسب! صدق وصفایاں ہے انہیں کے دم تک
مصلحت برہمیِ صحبتِ رنداں میں نہیں

یاں بھی ہے کون و مکاں سے دلِ وحشی آزاد
جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

ٹھیرتے ٹھیرتے دل یوں ہی ٹھہر جائے گا
بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں

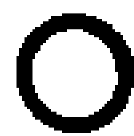
کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے الجھاؤ ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں

آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے
اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

حالیِ زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مردِ مسلماں میں نہیں



غمِ فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں
شادیِ وصل بھی عاشق کو سزاوار نہیں

خوبروئی کے لیے زشتیِ خُو بھی ہے ضرور
سچ تو یہ ہے کہ کوئی تجھ سا طرح دار نہیں

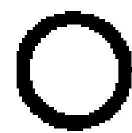
قول دینے میں تأمُّل نہ قسم سے انکار
ہم کو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں

کل خرابات میں اک گوشہ سے آتی تھی صدا
دل میں سب کچھ ہے مگر رخصتِ گفتار نہیں

حق ہوا کس سے ادا اس کی وفاداری کا
جس کے نزدیک جفا باعثِ آزار نہیں

دیکھتے ہیں کہ پہنچتی ہے وہاں کون سی راہ
کعبہ و دیر سے کچھ ہم کو سروکار نہیں

ہوں گے قائل وہ ابھی مطلعِ ثانی سن کر
جو تجلی میں یہ کہتے ہیں کہ تکرار نہیں



میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے
جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں

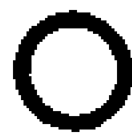
چشمِ بد دور بہت پھرتے ہیں اغیار کے ساتھ
غیرتِ عشق سے اب تک وہ خبردار نہیں

ہو چکا ناز اٹھانے میں ہے گو کام تمام
للہِ الحمد کہ باہم کوئی تکرار نہیں

مدتوں رشک نے اغیار سے ملنے نہ دیا
دل نے آخر یہ دیا حکم کہ کچھ عار نہیں

اصلِ مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا
ورنہ ہم اور کسی شے کے طلب گار نہیں

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں



وحشت میں تھا خیالِ گل و یاسمن کہاں
لائی ہے بُوے اُنس نسیمِ چمن کہاں

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی
جائے گا دَیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں

اہلِ طریق جس کو سمجھتے ہیں زادِ راہ
وھاں دخل دست بردِ کواے راہزن کہاں

فصلِ خزاں کمیں میں ہے صیاد گھات میں
مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں

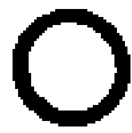
لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرفِ آشنا
لے جائے ہم کو دیکھیے ذوقِ سخن کہاں

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں انہیں مگر
وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

دل ہو گیا ہے لذتِ غربت سے آشنا
اب ہم کہاں ہوائے نشاطِ وطن کہاں

کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بیدادفن کہاں

روکا بہت کل آپ کو حالی نے واں مگر
جاتا ہے محوِ شوق کا دیوانہ پن کہاں



کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

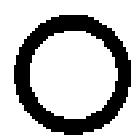
کوئی دن بُو الہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں

کہیں انجام آ پہنچا وفا کا
گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں



مرے دل میں ہو گو مجھ سے نہاں ہو
مجھے بھی ڈھونڈ لینا تم جہاں ہو

نہ چھیڑوں تذکرہ وصلِ عُدو کا
اگر سمعِ مبارک پر گراں ہو

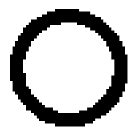
تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

بہت بے قدر ہوں محفل میں تیری
کہیں ناخواندہ تو بھی میہماں ہو

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں
بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو

کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے
جسے سُننی ہماری داستاں ہو

موثر ہے بہت حالی ترا وعظ
کل اس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو



حکم ہے پیرِ مغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ
خیر کفارۂ عصیاں ہے پیو اور پلاؤ

دل کو کس طرح سمجھئے کہ وہی ہے یہ دل
وہ امیدیں ہیں نہ ارماں وہ امنگیں ہیں نہ چاؤ

یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر
تو تو اچھا ہے مگر تیرے برے ہیں برتاؤ

دوست ہوں جس کے ہزاروں وہ کسی کا نہیں دوست
سچ بتا تجھ کو کسی سے بھی ہے دنیا میں لگاؤ

تو وہی برقِ جہاں سوز ہے بن خواہ نہ بن
ہے برابر ترا بے ساختہ پن اور بناؤ

ایک ہی دوست اور اس سے ہمیں چھٹواتے ہو
ناصحو، اب تمہیں دشمن کہیں یا دوست بتاؤ

ہو گیا ذکرِ قیامت تو اجیرن واعظ
باتیں کچھ اور کرو قصہ کوئی اور سناؤ

تجھ کو اے ابرِ بلا دیکھ کے جی چھوٹ گیا
ایک ہی بار تم اے بادلو اس طرح نہ چھاؤ

پہنچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا
ڈگمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ

دیکھیں کس طرح نہ سرسبز ہو پھر کشتِ امید
آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مل کے بہاؤ

اے شرافت تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک
آج کل کیجیے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ

قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ
وقت اب ہاتھ سے جاتا ہے جو آتے ہو تو آؤ

اس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

ہ

درِ فیضِ حق بند جب تھا نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ

ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد
بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ

کچھ اور آؤ بن کر تم اے میرو مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

یہ طبلِ تہی ہیں جو بنکارتے ہیں
جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

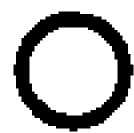
دیا تو نے یاں جس بہانے سے چاہا
ہنر کام آیا نہ علم و ادب کچھ

ہے افسردہ مجلس کی خست سے واعظ
وہ گرمائے گا یہ پسیجیں گے جب کچھ

تم اپنی سی کہنی تھی جو کہہ چکے سب
نہیں ناصحو تم پہ الزام اب کچھ

یہ ہے میر مجلس کہ چینی کی مورت
ٹٹولو تو ہیچ اور جو دیکھو تو سب کچھ

کوئی لقمۂ چرب تاکا ہے شاید
یہ حالی کی عزلت نہیں بے سبب کچھ



بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت
جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

کرو علم سے اکتسابِ شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

مصیبت کا ایک اک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا
مبادا کہ ثابت ہو خست زیادہ

پھر اوروں کی تکتے پھرو گے سخاوت
بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ

کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن
جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا
نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ

وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا
جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ

نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے
خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ

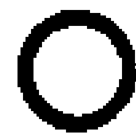
ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم
پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

بکے مفت یاں ہم زمانہ کے ہاتھوں
پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر
نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ



حقیقت محرمِ اسرار سے پوچھ
مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ

وفا اغیار کی اغیار سے سن
مری الفت درودیوار سے پوچھ

ہماری آہِ بے تاثیر کا حال
کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ

دلوں میں ڈالنا ذوقِ اسیری
کمندِ گیسوئے خمدار سے پوچھ

دلِ مہجور سے سن لذتِ وصل
نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ

نہیں جز گریۂ غم حاصلِ عشق
ہماری چشمِ دریا بار سے پوچھ

نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست
کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ

فریبِ وعدۂ دلدار کی قدر
شہیدِ خنجرِ انکار سے پوچھ

فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل
یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پوچھ

تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم
وہ تصویرِ خیالِ یار سے پوچھ

متاعِ بے بہا ہے شعر حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

ی

ہے ان کی دلاتی پر ہم کو تو بدگمانی
وہ ہم کو دوست سمجھیں یہ ان کی مہربانی

بے جرم کوئی آخر کب تک سنے ملامت
ناصح سے ہم کو اپنی کہنی پڑی کہانی

عاشق کے دل کو ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہے
دیتا نہیں وہ لذت پیاسے کو سرد پانی

امیدِ وصل سے ہے کچھ جی چھڑائے دیتا
جو کچھ سنا ہے ہم نے مشاطہ کی زبانی

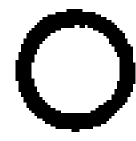
ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں شادمانی

صبر و سکوں سے ہم کو یہ بھی نبیڑنے دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اے کاہشِ نہانی

پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویراں
ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعف و ناتوانی

دیکھا جمالِ جاناں آنکھوں نے اور نہ دل نے
کیا جانے کس ادا سے کی اس نے دلستانی

اک نکتہ کے بیاں سے سربر نہ ہو گے حالی
چلتا نہیں کسی کا یاں لافِ نکتہ رانی



کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے
گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام بلا سے

جو کچھ ہے سو ہے اس کے تغافل کی شکایت
قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے

دلاّلہ نے امید دلائی تو ہے لیکن
دیتے نہیں کچھ دل کو تسلی یہ دلا سے

ہے وصل تو تقدیر کے ہاتھ اے شہِ خوباں
یاں ہیں تو فقط تیری محبت کے ہیں پیاسے

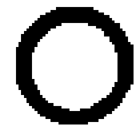
پیاسے ترے سرگشتہ ہیں جو راہِ طلب میں
ہونٹوں کو وہ کرتے نہیں تر آبِ بقا سے

درگزرے دوا سے تو بھروسے پہ دعا کے
درگزریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے

اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو
تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے

حالی دلِ انساں میں ہے گم دولتِ کونین
شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان وعطا سے

جب وقت پڑے دیجیے دستک درِ دل پر
جھکیے فُقَرا سے نہ جھجکیے اُمَرا سے



کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار
مَرو کس کا ہے بدخشان و ختن کس کا ہے

دم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ یہ بیتِ حزن کس کا ہے

مطمئن اس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانئے یہ چرخِ کہن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذاتِ خدا
ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کس کا ہے

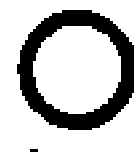
آج کچھ اور دنوں سے ہے سوا استغراق
عزمِ تسخیر پھر اے شیخِ زمن کس کا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے

عشق ادھر عقل ادھر دھن میں چلے ہیں تیری
رستہ اب دیکھئے دونو میں کٹھن کس کا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اس کی
ولولہ تجھ میں یہ اے مرغِ چمن کس کا ہے

ہیں فصاحت میں مُسَلَّم واعظ و حالی دونو
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے



ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

سپاہ و میر سبھی باغ باغ ہیں لیکن
بھیر روتی ہے اور ہاتھ ملتی جاتی ہے

کہا جو میں نے وفا کرنے آئے ہیں احباب
کہا زمانہ کی عادت بدلتی جاتی ہے

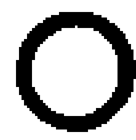
قلق انہیں نہیں گر دوستوں سے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے

بہت سے کھو دیئے خلجان بینوائی نے
ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے

ہوئے ہیں بارِ امانت سے تیرے سب عاجز
زمیں بھی اپنے خزانے اگلتی جاتی ہے

اڑے گی خاک تقدس کی اب سرِ بازار
فقیہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے

نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ حالی
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے



بری اور بھلی سب گزر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی

ملے گا نہ گلچیں کو گُل کا پتا
ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی

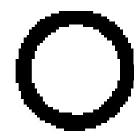
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا
کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی

ادھر ایک ہم اور زمانہ ادھر
یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی

بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ
یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی

نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں
یونہی عمر ساری گزر جائے گی

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی



سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی
کہ ان کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی

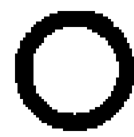
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گلچینی ہے یا لُٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی

کمالِ کفش دوزی علمِ افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

رہی دانائی آخر غالب آ کر پہلوانی پر
گئے چیں مان سب چینی و فرغانی و قبچاقی

ہمارے ظرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ
لنڈھانے خم پہ خم غیروں پہ کیوں ممسک ہو گر ساقی

مدارج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے حالی
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اک غیب کا باقی



اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز
اس میں شہری بھی ہیں کوہی بھی ہیں صحرائی بھی

آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مندی
اس میں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی

جو چھپاتے ہیں حق اندیشۂ رسوائی سے
گھات میں ان کی لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی

دوست گر بھائی نہ ہو دوست ہے تو بھی لیکن
بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی

اے غم دوست تجھی پر نہیں اپنی گزران
کچھ فتوح اس کے سوا اور ہے بالائی بھی

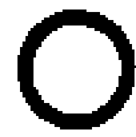
دل غنی رکھتے ہیں اے دولتِ دنیا جو لوگ
تیور ان کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی

عقل ہے اپنی حماقت کے چھپانے کی انہیں
جن میں کچھ ساتھ حماقت کے ہے خودرائی بھی

عقل اور حسن پہ جن کے بھری مجلس ہو گواہ
ان کو خودرائی بھی پھبتی ہے خود آرائی بھی

ملنے دے گی نہ اجل تم سے ہمیں جی بھر کر
فرصت اے دوستو دنیا سے اگر پائی بھی

جی گئے ہم پہ رہے مردوں سے بدتر حالی
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی



رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی
بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

برائی ہے رندوں میں بھی شیخ! لیکن
کہاں یہ برائی کہاں وہ برائی

گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب
عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی

رکا ہاتھ جب بن گئے پارسا تم
نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی

بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے
سوا اس کے منعم میں ہے کیا بڑائی

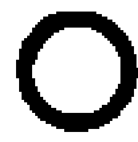
جو کہیے تو جھوٹی جو سنیے تو سچی
خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی

ہوئی آ کے پیری میں قدرِ جوانی
سمجھ ہم کو آئی پہ ناوقت آئی

وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پربت
وہ پربت کو بھی کر دکھاتا ہے رائی

جوانی میں عاشق تھے اب ہم ہیں ناصح
جو دھاں دل پہ لی تھی تو یاں منہ کی کھائی

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو حالی
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی



وصل کا اس کے دلِ زار تمنائی ہے
نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے

قطعِ امید نے دل کر دیئے یکسو صد شکر
شکل مدت میں یہ اللہ نے دکھلائی ہے

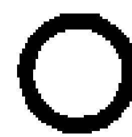
قوتِ دستِ خدائی ہے شکیبائی میں
وقت جب آ کے پڑا ہے یہی کام آئی ہے

ڈر نہیں غیر کا جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے
ہم نے جب کھائی ہے اپنے ہی سے زک کھائی ہے

نشہ میں چور نہ ہوں جھانجھ میں مخمور نہ ہوں
پند یہ پیرِ خرابات نے فرمائی ہے

نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی
بعد مدت کے تمنا مری بر آئی ہے

بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی
سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے



اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

سامنا ہے موت کا، ہونا محبت سے دو چار
آئے اس میدان میں زاہد اگر کچھ جان ہے

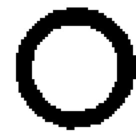
دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

عقل پھیلی پر نہ گھٹی حرص و آز انسان کی
لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے

چیونٹوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے

تجھ میں جوت اے شمع ہے کس برقِ عالم سوز کی
جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے

دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے



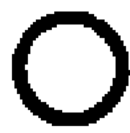
تم میں وہ سوز نہ تم میں ہے وہ ایماں باقی
رہ گیا کیا ہے اب اے گبرو مسلماں باقی

بزمِ دعوت میں رسائی ہوئی اپنی اس وقت
میزباں جب نہ رہا کوئی نہ مہماں باقی

حق ادا اک نگہِ لطف کا ہو گا کیونکر
دل و دیں لے چکے اور ہے ابھی احساں باقی

ظاہرا دردِ ی الفت کا نہیں چارہ پذیر
ورنہ چھوڑا نہیں ہم نے کوئی درماں باقی

توشہ موجود ہے حالی نہ سواری نہ رفیق
ابھی کرنے ہیں بہت کوچ کے ساماں باقی



پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے
شکوے وہ سب سنا کیے اور مہرباں رہے

کیا کیا ہیں دل میں دیکھیے ارماں بھرے ہوئے
ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے

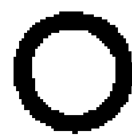
حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ امید
اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے

پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی
اتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے

دارا و جم کو تیرے گداؤں پہ رشک ہے
نرخِ متاعِ عشق الٰہی گراں رہے

حالی سے مل کے ہو گے تم افسردہ دل بہت
اگلے سے ولولے وہ اب اس میں کہاں رہے



کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرَسِ کارواں رہے

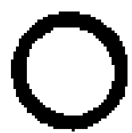
یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ
یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے

وصلِ مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس
ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیم جاں رہے

کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رُو سیاہ
تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالیؔ کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے



حق وفا کے جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے

تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عدو
عذر ان کی زباں پہ آنے لگے

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں
وہ اگر ہمت آزمانے لگے

ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی
غیر الفت بہت جتانے لگے

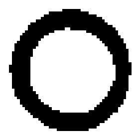
تم کو کرنا پڑے گا عذرِ جفا
ہم اگر دردِ دل سنانے لگے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

جی میں ہے لوں رضائے پیرِ مغاں
قافلے پھر حرم کو جانے لگے

سرِ باطن کو فاش کر یارب
اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے



حشر تک یاں دل شکیبا چاہیے
کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیے

ہے تجلی بھی نقابِ روئے یار
اس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیے

غیر ممکن ہے نہ ہو تاثیرِ غم
حالِ دل پھر اسکو لکھا چاہئے

ہے دل افگاروں کی دلداری ضرور
گر نہیں الفت مدارا چاہئے

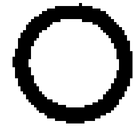
ہے کچھ اک باقی خلش امید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہئے

دوستوں کی بھی نہ ہو پروا جسے
بے نیازی اس کی دیکھا چاہیے

بھا گئے ہیں آپ کے انداز و ناز
کیجیے اغماض جتنا چاہیے

شیخ! ہے ان کی نگہ جادو بھری
صحبتِ رنداں سے بچنا چاہیے

لگ گئی چپ حالیِ رنجور کو
حال اس کا کس سے پوچھا چاہیے



جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے
قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے

دمِ گریہ کس کا تصور ہے دل میں
کہ اشکِ دریا ہوا چاہتا ہے

خط آنے لگے شکوہ آمیز ان کے
ملاپ ان سے گویا ہوا چاہتا ہے

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو
وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے

ابھی لینے پائے نہیں دم جہاں میں
اجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے

مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہیں رخصت
کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے

فزوں تر ہے کچھ ان دنوں ذوقِ عصیاں
درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

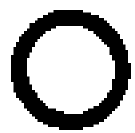
قلق گر یہی ہے تو رازِ نہانی
کوئی دن میں رُسوا ہوا چاہتا ہے

وفا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک
دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے

بہت حظ اٹھاتا ہے دل تجھ سے مل کر
قلق دیکھئے کیا ہوا چاہتا ہے

غمِ رشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم
سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے

بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالی
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے



جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا اگر کل نہ لیا یاد رہے

شوق بڑھتا گیا جوں جوں رکے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر
نہ ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے

یاد آؤ گے بہت لطف سمجھ کر کیجے
اس بھلائی کا ہے انجام برا یاد رہے

شیخ یاں شرمِ گنہ شوق بھلا دیتا ہے
توبہ ان کی ہے جنھیں اپنی خطا یاد رہے

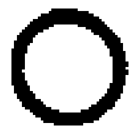
وادیِ عشق میں موسیٰ کو ہو گر رخصتِ دید
ہاتھ کھوائیں جو پھر کفش و عصا یاد رہے

خضر نے پانو اگر دشتِ فنا میں رکھا
بھول جائیں گے رہِ آبِ بقا یاد رہے

دل بری طرح لگا عشقِ بتاں میں اے شیخ
دیں پڑا پائیں اگر اب کے خدا یاد رہے

چارہ گر! کار باندازۂ تدبیر نہیں
کچھ ہمت اگر وقتِ دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا یاد رہے



ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے
آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے

افسوں شبِ وصال کے وھاں کارگر نہیں
نالے شبِ فراق کے تاثیر کر چکے

اے دل اب آزمائشِ تقدیر کا ہے وقت
وہ امتحانِ بُرشِ شمشیر کر چکے

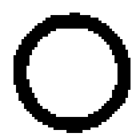
کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

بھولے رہے تصورِ مژگاں میں چند روز
دیکھا تو دل کو ہم ہدف تیر کر چکے

جاں لب تک انتظار میں آتی ہے بار بار
مشاطہ جلد تر کہیں تقریر کر چکے

دل لے کے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ
گویا کہ اک جہان کو تسخیر کر چکے

حالی اب آؤ پیروِیِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے



نہ وھاں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے
محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات
مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے

عدو سے بات محفل میں نہ کرنی
جو سچ پوچھو تو جائے سوءِ ظن ہے

بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار
تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد
نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے

کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت
مگر جوشِ سخن مہرِ دہن ہے

رہے لاہور میں آ کر سو جانے
یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے

نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسف
مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے

یہاں بے گانگی ہے اس قدر عام
کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ
نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہکن ہے

مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور
تصور میں مرے اک انجمن ہے

مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم
خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے

بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول
جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے

بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بُو
جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے

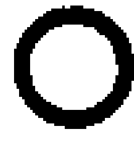
عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی
مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے

نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام
یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے

گریں نظروں سے سب باتیں پرانی
مگر الفت کہ اک رسم کہن ہے

بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی!
یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

کیا ہے اس نے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہم کو ابھی اس میں سخن ہے



دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خودنمائی کی

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن
ہم سے باتیں کرو صفائی کی

دل رہا پائے بندِ الفتِ دام
تھی عبث آرزو رہائی کی

دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے
رکھیے امید دل ربائی کی

شہر و دریا سے باغ و صحرا سے
بُو نہیں آتی آشنائی کی

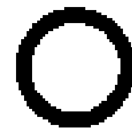
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

بخت ہمداستانِ شیدا
تو نے آخر کو نارسائی کی

صحبتِ گاہ گاہ ہی رشکی
تو نے بھی ہم سے بے وفائی کی

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے
ساعت آ پہنچی اس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی



کر دیا خوگرِ جفا تو نے
خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

دور پہنچی تھی اپنی آزادی
پر خدا جانے کیا کیا تو نے

کیوں نہ آئیں گے یاں وہ اے ہمدم
بس سنا میں نے اور کہا تو نے

گوش و لب ساتھ لائے تھے ہم آج
نہ کہا اور نہ کچھ سنا تو نے

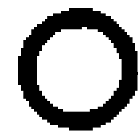
صبر کا ہے بہت بُرا انجام
ہم کو سمجھا ہے دل میں کیا تو نے

ابتدائے وفا ہے سر دینا
میری دیکھی نہ انتہا تو نے

دل سے قاصد بنا کے وعدۂ وصل
اور کھویا رہا سہا تو نے

ایک عالم کو خوش کیا اے رشک
ہم کو کس سے خفا کیا تو نے

جی میں کیا ہے جو بخشوایا آج
حالیؔ اپنا کہا سنا تو نے



کر کے بیمار دی دوا تو نے
جان سے پہلے دل لیا تو نے

رہروِ تشنہ لب نہ گھبراتا
لب لیا چشمۂ بقا تو نے

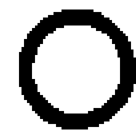
شیخ جب دل ہی دیر میں نہ لگا
آ کے مسجد سے کیا لیا تو نے

دور ہوئے دلِ مآل اندیش
کھو دیا عمر کا مزا تو نے

ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ
کیا کیا چشم آشنا تو نے

دل و دیں کھو کے آئے تھے سوئے دیر
یاں بھی سب کچھ دیا خدا تو نے

خوش ہے امیدِ خلد پر حالی
کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے



دل کو درد آشنا کیا تو نے
دردِ دل کو دوا کیا تو نے

طبعِ انساں کو دی سرشتِ وفا
خاک کو کیمیا کیا تو نے

وصلِ جاناں محال ٹھہرایا
قتلِ عاشق روا کیا تو نے

تھا نہ جز غم بساطِ عاشق میں
غم کو راحت فزا کیا تو نے

جان تھی اک وبالِ فرقت میں
شوق کو جاں گزا کیا تو نے

تھی محبت میں ننگ منتِ غیر
جذبِ دل کو رسا کیا تو نے

قطعہ

راہ زاہد کو جب کہیں نہ ملی
درِ مے خانہ وا کیا تو نے

قطع ہونے ہی جب لگا پیوند
غیر کو آشنا کیا تو نے

تھی جہاں کارواں کو دینی راہ
عشق کو رہنما کیا تو نے

ناؤ بھر کر جہاں ڈبونی تھی
عقل کو ناخدا کیا تو نے

بڑھ گئی جب پدر کو مہرِ پسر
اس کو اس سے جدا کیا تو نے

جب ہوا ملک و مال رہزنِ ہوش
بادشہ کو گدا کیا تو نے

جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد
درد کو بے دوا کیا تو نے

جب دیا راہرو کو ذوقِ طلب
سعی کو نارسا کیا تو نے

پردۂ چشم تھے حجاب بہت
حسن کو خود نما کیا تو نے

عشق کو تابِ انتظار نہ تھی
غرفہ اک دل میں وا کیا تو نے

حرم آباد اور دیر خراب
جو کیا سب بجا کیا تو نے

سخت افسردہ طبع تھے احباب
ہم کو جادو نوا کیا تو نے

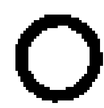
پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب
کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالؔی اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے

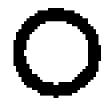
رباعیات

توحید

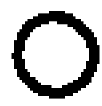
کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا



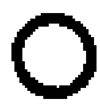
ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا



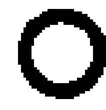
طوفاں میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا
وھاں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا



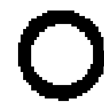
جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور
منکر بھی پکار اٹھتے ہیں تجھ کو مجبور
خفّاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ
خورشید کا شش جہت میں پھیلا جب نور



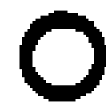
جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے
دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سکھ میں بھول جائیں اَطفال
لیکن انہیں دکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے



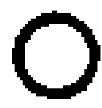
مٹی سے، ہوا سے، آتش و آب سے یاں
کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک
گنجینۂ غیب میں اسی طرح نہاں



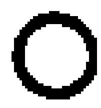
ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لیے
طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور
سب اپنے لیے ہیں اور تُو سب کے لیے



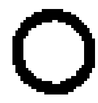
کیا ہو گی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد
دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد
پر جو کہ ہیں تجھ سے لَو لگائے بیٹھے
رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد



زہّاد کو تو نے محوِ تجدید کیا
عشاق کو مستِ لذتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی
توحید کو تو نے آ کے توحید کیا



بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا
اور اُمیّوں کو خیر امم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار
بچھڑے ہوئے گلّہ کو بہم تو نے کیا



بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف
یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
آبا کو بھی ہے تیری ابوّت سے شرف

صلحِ کل

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ترکِ شعرِ عاشقانہ

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

پیرانِ زندہ دل

خوش رہتے ہیں دکھ میں کامرانوں کی طرح
ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل ان کے ہیں ظرف ان کے جو کرتے ہیں پیر
ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں
پر آیا جب امتحاں کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہیے اب کیا ہے صلاح
فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہاں

عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا
یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پہ اتنی ہے خبر
اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھیرائیو بد اے فرزند
ایک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

دوستوں سے بے جا توقع

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے
جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے
صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پہ نہ جوانو مفتوں
گردن پہ نہ لو عقلِ خداداد کا خوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے اب تم
کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اور جنوں

غرور سب عیبوں سے بدتر ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
پر عیب سے بچئے تا بمقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو
گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور

گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ زباں سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسنِ گفتار
بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

شرطِ قبول

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں
پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مفت یہ امکاں ہے مگر
عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں

طالب کو سوچ سمجھ کر پیر بنانا چاہیے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہلِ عرفان و یقیں
پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہوں نادان کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی
اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجامِ ترقیِ بشر
یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہے گا کوئی انسان میں عیب
ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

مسرف کو کیونکر فراغت حاصل ہو سکتی ہے

اک منعمِ مسرف نے یہ عابد سے کہا
کر میرے لیے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سوئے چرخ
محتاج کر اس کو جلد اے بارِ خدا

کام کی جلدی

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام ان کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

غرض

ہے نفس میں انساں کے جبلی یہ مرض
ہر سعی پہ ہوتا ہے طلب گار عوض
جو خاص خدا کے لیے تھے کام کیے
دیکھا تو نہاں ان میں بھی تھی کوئی غرض

انقلابِ روزگار

بس بس کے ہزاروں گھر اجڑ جاتے ہیں
گڑ گڑ کے علم لاکھوں اکھڑ جاتے ہیں
آج اس کی ہے نوبت تو کل اس کی باری
بن بن کے یونہی کھیل بگڑ جاتے ہیں

تقاضائے سن

حالی کو جو کل فسردہ خاطر پایا
پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی امید
وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آثارِ زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان
اولاد کو ستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جوان
ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

شانِ ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان
برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقان
یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لایق ہونا
شیریں سخنی سے شہد فایق ہونا
ممکن نہیں جب تک کہ نہ ہو دل میں نفاق
آساں نہیں مقبولِ خلایق ہونا

مسلمانوں کی بے مہری

جب تک کہ نہ ہو دشمن اخواں پکا
ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے
بنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکا

مکرو ریا

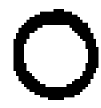
حالی رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا
خطرہ انہیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن ان بھیڑیوں سے واجب ہے حذر
بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

جوہرِ قابلیت

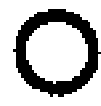
ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں
پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ
ہیں طوطی و رازنی انہیں شکلوں میں نہاں

علم

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھیرایا تجھے راس المال



اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے
سرچشمۂ نعما و ایادی تو ہے
آسائشِ دو جہاں ہے سایہ میں ترے
دنیا کا وسیلۂ دیں کا ہادی تو ہے



ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں
مشرق کو وہ فیض تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہِ نخشب کی طرح
رہتی ہیں شعاعیں تیری محدود وہیں

خاندانی عزت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے
عزت نہیں اس کو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے کھات کا نسب بھی عالی
پر اس کو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا' مجھ سے ہی' عزت ہے جہاں
فرمایا' ہنر نے' میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی غلط ہے دونو کا بیاں
میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

توقع بے جا

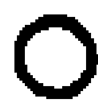
ہیں یار رفیق' پر مصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز لیک ذلت میں نہیں
اس بات کی انساں سے توقع ہے عبث
جو نوعِ بشر کی خود جبلت میں نہیں

عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی
اتنی ہی مغائرت ہے یاں اور خویشی
وہ دوست نہیں جس نے کیا فکرِ مآل
ضدّین ہیں دوستی و دور اندیشی

عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیشِ دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے



اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا
سلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل
بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

غیبت

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئیِ خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں

عشق

اے عشق کیا تو نے گھرانوں کو تباہ
پیروں کو خرف اور جوانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری
قوموں کو ذلیل، خاندانوں کو تباہ

سببِ زوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم
سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت
یا ہے کوئی مولوی وزیرِ اعظم

دین و دنیا کا رشتہ

دنیا کو دیئے دین نے اسرار و حِکَم
دنیا نے کمر دین کی تھامی جس دم
گر دین کی ممنون بہت ہے دنیا
دنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

آزادگانِ راستباز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ
کافر کہا واعظ نے انہیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت
لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

بے پروائی و بے غیرتی

اسباب پہ گر نظمِ جہاں کا ہے مدار
اس قوم کا جیتنا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں ہے جس کو ہرگز پروا
ذلت سے نہیں ہے جس کو ہرگز کچھ عار

عفو باوجودِ قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

سختی کا جواب نرمی ہے

فتنہ کو جہاں تک ہو دیجے تسکیں
زہر اگلے کوئی تو کیجے باتیں شیریں
غصہ غصے کو اور بھڑکاتا ہے
اس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

ہمت

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لے کر سو بار
آخر سرِبام لے کے پہنچا تو کہا
"مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار"

کم ہمتی

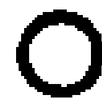
جبریّہ و قدریّہ کی بحث و تکرار
دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور
جو با ہمت تھے بن گئے وہ مختار

پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا
ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذت سے ندامتوں کی جانا ہم نے
دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

تاسف بر وفاتِ نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم نیر تخلص دہلوی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طنّاز
آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبلِ زار
سو اس کی بھی کل سے نہیں آتی آواز



غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیّر باقی
وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

محنت

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی
جب تک نہ چرائیں بکریاں مدیَن میں

گدائی کی ترغیب

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا
کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا ان کی گردن پہ وبال
دے دے کے جنہوں نے مانگنا سکھلایا

تکفیرِ اہلِ اسلام

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں
سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہو گا مرقد میں سوال
تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں

ترکِ عاشقانہ گوئی

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو
کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں
چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

تنزّلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مَد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اول کوشش اور بعد دعا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے
پھر چاہیے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا
پائی نہ نجات نوح نے طوفاں سے

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لیے
بنتی نہیں زندگی میں بے کام کیے
جیتے ہو تو کچھ کیجیے زندوں کی طرح
مردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے

جھوٹی نمائش

ہیں جھوٹ کے سچ میں سب سمونے والے
بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جن کی جیبوں میں مدام
اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار
بدظن نہ ہو عیب اس میں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر
کر حسن و جمال کا نہ اس کے انکار

سکوتِ درویشِ جاہل

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ
خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ منہ سے یا نہ بولیں حضرت
معلوم ہے ہم کو جتنے پانی میں ہیں آپ

ملحدوں کا طعن مسلمانوں پر

کہتا تھا کل اک منکرِ قران و خبر
کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑ کر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ
کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

دہری کا الزام گور پرست پر

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا
ہو گا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھ سا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر
اس سے بھی گیا کہ جس کے لاکھوں ہوں خدا

دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق؟ سماعت نہ ہو جب کانوں میں
دانائی کی باتوں میں اور افسانوں میں
غربت میں ہے اجنبی مسافر جس طرح
دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

رفارم کی حد

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی
کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ
دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اپنی تعریف سن کر ناک چڑھانا

تعریف سے کھل جاتے ہیں ناداں فی الفور
داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
ہوتے ہیں بہت وہ مدح سن کر ناخوش
مقصود یہ ہے کہ ہو ستائش کچھ اور

حسنِ ظن اصل حال نہیں کھلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں
نیکی میں شک اس کی کوئی لایا ہی نہیں
ہو سکہ رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ
پر اس کو کسی نے یاں تپایا ہی نہیں

دینداروں کی برائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حال اہلِ اسلام
اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوام تمام
بدپرہیزی سے بگڑے اپنی بیمار
اور مفت میں ہو گیا مسیحا بدنام

فکر عقبیٰ

منزل ہے بعید باندھ لو زاد سفر
مواج ہے بحر رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے لے چلو مال کھرا
ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہگذر

انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انساں
ممکن ہے بدی کا نہ رہے اس میں نشاں
ممکن تو ہے سب کچھ پہ حقیقت یہ ہے
انسان ہے اب تک وہی قرن الشیطاں

سلاطین کا عشق

ہر چند برا ہے عشق کا سب کے مآل
پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصا بدفال
سلطاں ہے اگر ظلِ الٰہی تو عشق
ہے ظلِ الٰہی کے لیے وقتِ زوال

وقت کی مساعدت

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ
پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی
پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

بڑھاپے میں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر
انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اٹھا چکے اب حالی
مجلس کرو برخاست ہوا وقتِ سحر

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا
زردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک
ہے جوہرِ انساں کی کسوٹی سونا

حد سے زیادہ غصہ قابلِ عفو ہے

غصہ پہ کسی کے غصہ آتا ہے وہیں
جب تک کہ رہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر
پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تو تو ہی نہیں

سفہا کی مدح وذم

کرتے ہیں سفیہ اگر مذمت تیری
کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر (نصیب اعدا)
رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

مرضِ پیری لاعلاج ہے

اب ضعف کے پنجہ سے نکلنا معلوم
پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جس کا پانا ہے محال
آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

اسراف

مسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
گر بُخل پہ لوگ ان کے ہنسیں بہتر ہے
اس سے کہ فضولیوں پہ ان کی روئیں

ردِّ سوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے نہ صواب
زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب
بدتر ہے ہزار بار اے دُوں ہمت
سائل کے سوال سے ترا تلخ جواب

کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں
جو دیکھ کے چکھ کے دل سے بھائے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھوک
جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال
مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی
اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

اچھوں کو برا سننے میں بھی مزا آتا ہے

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا
جو کر کے بھلا خلق سے سنتے ہیں برا
ان گالیوں کا ہے جن کو چسکا حالی
آتا نہیں ان کو کچھ دعاؤں میں مزا

شکریہ مدحِ کلامِ راقم

جوشِ خُمِ بادہ جام خالی میں ہوا
پھر ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا
تسلیم نے دی کچھ اس طرح دادِ سخن
مجھ کو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

احسانِ بے منت

احساں کے ہے گر صلہ کی خواہش تم کو
تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو گر احسان تو کر دو اسے عام
اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

قانون بداخلاقی سے مانع نہیں ہوتے

قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار
حاشا کہ ہو ان پہ نظمِ عالم کا مدار
جو نیک ہیں ان کو نہیں حاجت ان کی
اور بد نہیں بنتے نیک ان سے زنہار

مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہلِ شر سے اڑنا نہ کہیں
بھڑکے گی مدافعت سے اور آتش کیں
گر چاہتے ہو کہ چپ رہیں اہلِ خلاف
جُز ترکِ خلاف کوئی تدبیر نہیں

ٹیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل
اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اٹھ کر کہ حضور
ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل

انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے
بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

آہیں پیری میں شیخ بھرتے نہیں یوں
دل دیتے ہیں پر جی سے گزرتے نہیں یوں
تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا
جو جیتے ہیں اس طرح وہ مرتے نہیں یوں

واعظوں کی سخت کلامی

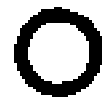
اک گبر نے پوچھے جو اصولِ اسلام
واعظ نے درشتی سے کیا اس سے کلام
بولا کہ حضور مقتدا ہوں جس کے
ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

نوابِ وقار الامرا اقبال الدولہ بہادر کی شان میں

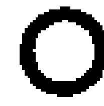
توفیق نے اس کی چھوڑ دی ہمراہی
اقبال پہ جس نے فتح یابی چاہی
حالی لے جائے کون بازی ان سے
ہے جن کی رگوں میں خونِ آصف جاہی

رباعیاتِ قدیم

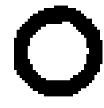
ہو عیب کی خُو یا کہ ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اس گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت



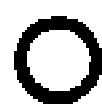
مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے
جب یاد کریں گے مجھے تب روئیں گے
الفت پہ، وفا پہ، جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روئے تھے تو اب روئیں گے



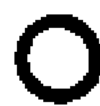
فرقت میں بشر کی رات کیونکر گزرے
اک خستہ جگر کی رات کیونکر گزرے
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیونکر گزرے



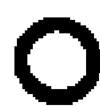
یاد اس کی یہاں ورد مدام اپنا ہے
خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجیے کہ ہے نام اس کا
کس طرح نہ کیجیے کہ کام اپنا ہے



کیا پاس تھا قولِ حق کا اللہ اللہ
تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعتِ یزیدِ گمراہ
لَاحَولَ وَلاَ قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ



حُر کہتا تھا اے دل شہِ ذی جاہ سے مل
گمرہ نہ ہو رہبرِ حق آگاہ سے مل
سرگشتگیِ کوئے ضلالت کب تک
اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل



گر کفر میں فرعون کا ثانی نکلا
اک شام میں بیداد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحرِ غفلت کی یزید
واں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

قصیدے، ترکیب بند، مسدس چند اور قطعے مختلف مضامین پر

بہ ترتیبِ اوقاتِ تحریر

۱۔ قصیدۂ نعتیہ

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دو جہاں کے لیے
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم میں
عداوت اس کی عذابِ الیم جاں کے لیے

وہ شاہ جس کا محب امن و عافیت میں مدام
محبت اس کی حصارِ حصیں اماں کے لیے

وہ چاند جس سے ہوئی ظلمتِ جہاں معدوم
رہا نہ تفرقۂ روز و شب زماں کے لیے

وہ پھول جس سے ہوئی سعیِ باغباں مشکور
رہی نہ آمد و رفتِ چمن خزاں کے لیے

ہلال مکہ کا، ماہِ دو ہفتہ یثرب کا
فروغِ قوم کے اور شمعِ دو دماں کے لیے

گھر اس کا موردِ قرآن و مہبطِ جبریل
در اس کا کعبۂ مقصود انس و جاں کے لیے

سپہر گرمِ طواف اس کی بارگاہ کے گرد
زمین سر بسجود اس کے آستاں کے لیے

وہ لحظہ لحظہ تفقّد وہ دمبدم الطاف
رضائے خاطرِ یارانِ جانفشاں کے لیے

وہ گو نہ گو نہ مدارا وہ بات بات میں مہر
کشایشِ گرہِ کینِ دشمناں کے لیے

گہ افتخار مقابل میں اہلِ نخوت کے
گہ انکسار مداراتِ میہماں کے لیے

کہیں ہلاک میں تاخیر قومِ سرکش کے
کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لیے

صفائے قلبِ حسود ان کینہ خواہ کے ساتھ
دعائے خیر بد اندیش و بدگماں کے لیے

کہیں مقدمۃ الجیشِ انبیاء و رُسُل
کہیں وہ خاتمۃ الباب داستاں کے لیے

مدینہ مرجع و ماوائے اہلِ مکہ ہوا
مکیں سے رتبہ یہ حاصل ہوا مکاں کے لیے

اسی شرف کے طلب گار تھے کلیم و مسیح
نویدِ امتِ پیغمبرِ زماں کے لیے

بس اب نہ غول کا کھٹکا نہ راہزن کا خطر
ہوا وہ قافلہ سالار کارواں کے لیے

شفیعِ خلق سراسر خدا کی رحمت ہے
بشارت امتِ عاصی و ناتواں کے لیے

شفاعتِ نبویؐ ہے وہ برقِ عصیاں سوز
کہ تخمِ خس ہے جہاں کفرِ دو جہاں کے لیے

خدا کی ذاتِ کریم اور نبیؐ کا خلقِ عظیم
گنہ کریں تو کریں رخصت انس و جاں کے لیے

اسی کا دیں ہے کہ ہے گلشنِ ہمیشہ بہار
وگرنہ ہر گل و گلزار ہے خزاں کے لیے

عبور لجۂ عصیاں سے کس طرح ہو اگر
وہ ناخدا نہ ہو اس بحرِ بیکراں کے لیے

مریضِ حرص و ہوا پائے کب شفا جب تک
وہ چارہ گر نہ ہو اس دردِ جانستاں کے لیے

نہ حرف و صوت میں وسعت نہ کام و لب میں سکت
حقیقتِ شب معراج کے بیاں کے لیے

ارادہ عرش تک اک آن میں پہنچنے کا
کیا تھا عزم اولو العزمؐ نے کہاں کے لیے

کرم کا دیکھیے دامن کہاں تلک ہو فراخ
ہو میزبانِ خدا جب کہ میہماں کے لیے

زمیں پہ ٹھیرا ہے ماوائے شاہ عرش نشین
رہی نہ اب کوئی فوقیت آسماں کے لیے

اسی سے ہوتا ہے ظاہر عیارِ استعداد
محک ہے حُبِّ نبیؐ دل کے امتحاں کے لیے

اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربتِ مرگ
پیوں نہ آبِ بقا عمرِ جاوداں کے لیے

اگر بقیع میں گز بھر زمیں میسر آئے
کروں نہ طولِ اَمَل روضۂ جناں کے لیے

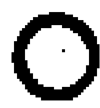
سمایا اس کا جو نقشِ قدم تصور میں
ہجومِ شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لیے

حریفِ نعتِ پیمبرؐ نہیں سخن حالی
کہاں سے لایئے اعجاز اس بیاں کے لیے

نبیؐ کا نام ہو وردِ زباں رہے جب تک
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

۲- ترکیب بند، مرثیہ ۱۲۸۵ء ہجری

مرثیہ جناب مرزا اسداللہ خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ غالب



کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی
وقت کوتاہ و قصہ طولانی

عیشِ دنیا سے ہو گیا دل سرد
دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی

کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال
گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی

ہے سراسر فریبِ وہم و گماں
تاجِ فغفور و تختِ خاقانی

بے حقیقت ہے شکلِ موجِ سراب
جامِ جمشید و راحِ ریحانی

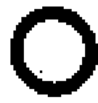
لفظ مہمل ہے نطقِ اعرابی
حرف باطل ہے عقلِ یونانی

ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی
اک تماشا ہے حسنِ کنعانی

نہ کروں تشنگی میں تر لبِ خشک
چشمۂ خضر کا ہو گر پانی

لُوں نہ اک مشتِ خاک کے بدلے
گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں



جس سے دنیا نے آشنائی کی
اس سے آخر کو کج ادائی کی

تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر
تو نے کی جس سے بے وفائی کی

ہے زمانہ وفا سے بے گانہ
ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی

یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اس کی
صلح میں چاشنی لڑائی کی

ہے یہاں حظِّ وصل سے محروم
جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی

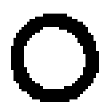
ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس
جس کو عادت نہ ہو گدائی کی

خندۂ گل سے بے بقا تر ہے
شان ہو جس میں دلربائی کی

جنسِ کاسد سے ناروا تر ہے
خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی

بات بگڑی رہی سہی افسوس
آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد



بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس
پاک دل پاک ذات پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

دل میں چبھتا تھا وہ اگر بالکل
دن کو کہتا دن اور رات کو رات

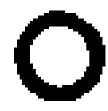
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مر گئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا



دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل
کس سے دادِ سخنوری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضموں ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہلِ میت جنازہ ٹھیرائیں

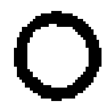
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہلِ انصاف غور فرمائیں

قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھیرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منھ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت



نثر حسن و جمال کی صورت
نظم غنج و دلال کی صورت

تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت

قال اس کا وہ آئینہ جس میں
نظر آتی تھی، حال کی صورت

اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی
شکلِ امکاں محال کی صورت

اس کی تاویل سے بدلتی تھی
رنگِ ہجراں وصال کی صورت

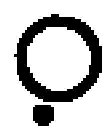
لطف آغاز سے دکھاتا تھا
سخن اس کا مآل کی صورت

چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت

لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ



شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشک بار ہے آج

نازشِ خلق کا محل نہ رہا
رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج

تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع
رخصتِ موسمِ بہار ہے آج

بارِ احباب جو اٹھاتا تھا
دوشِ احباب پر سوار ہے آج

تھی ہر اک بات نیشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

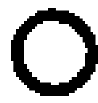
دل میں مدت سے تھی خلش جس کی
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج

دلِ مضطر کو کون دے تسکیں
ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج

تلخیِ غم کبھی نہیں جاتی
جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج

کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر
ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہان آباد



نقدِ معنی کا گنجداں نہ رہا
خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا

ساتھ اس کے گئی بہارِ سخن
اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا

ہوا ایک ایک کارواں بسالار
کوئی سالارِ کارواں نہ رہا

رونقِ حسن تھا بیاں اس کا
گرم بازارِ گلرخاں نہ رہا

عشق کا نام اس سے روشن تھا
قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا

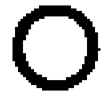
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں
گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

اہلِ ہند اب کریں گے کس پر ناز
رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہے گا نامِ ملوک
بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا

کوئی ویسا نظر نہیں آتا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اٹھ گیا' تھا جو مایہ دارِ سخن
کس کو ٹھیرائیں اب مدارِ سخن



کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا
اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا

شاعری کا کیا حق اس نے ادا
پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا

بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں
سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا

قطعہ

نذرِ سائل تھی جان تک لیکن
درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا

ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا
جان دینے پر اختیار نہ تھا

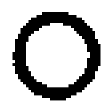
خاکساروں سے خاکساری تھی
سر بلندوں سے انکسار نہ تھا

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلا
دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا

بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب
ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیِ لفظِ آدمیت تھا



کچھ نہیں فرقِ باغ و زنداں میں
آج بلبل نہیں گلستاں میں

شہر سارا بنا ہے بیتِ حزن
ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں

ملک یکسر ہوا ہے بے آئیں
اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں

ختم تھی اک زباں پہ شیرینی
ڈھونڈھتے کیا ہو سیب و رماں میں

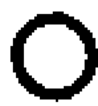
لب جادو بیاں ہوا خاموش
گوشِ گل وا ہے کیوں گلستاں میں

گوشِ معنی شنو ہوا بے کار
مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں

وہ گیا جس سے بزم روشن تھی
شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

نہ رہا جس سے تھا فروغِ نظر
سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہِ کامل میں آ گئی ظلمت
آبِ حیواں پہ چھا گئی ظلمت



ہند میں نام پائے گا اب کون
سکّہ اپنا بٹھائے گا اب کون

ہم نے جانی ہے اس سے قدرِ سلف
ان پر ایمان لائے گا اب کون

اس نے سب کو بھلا دیا دل سے
اس کو دل سے بھلائے گا اب کون

تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش
وہ جگہ دل میں پائے گا اب کون

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے
جا کے دلّی سے آئے گا اب کون

مر گیا قدردانِ فہمِ سخن
شعر ہم کو سنائے گا اب کون

مر گیا تشنۂ مذاقِ کلام
ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون

تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک
ہم کو چالیں بتائے گا اب کون

شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون

۳۔قصیدۂ نعتیہ

میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور
مجھ سے اٹھیں گے ان کے ناز ضرور

خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ
مجھ سے برتر ہے میری طبعِ غیور

خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے
میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور

نہ گنو اہلِ عصر میں مجھ کو
میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور

چشمۂ آبِ خضر کی مانند
چشمِ اہلِ جہاں سے ہوں مستور

دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت
مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور

مثلِ یوسف دکھائے جوہرِ ذات
جس کو بکنا ہو مفت یاں منظور

جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر
ہوں زمانہ کے ہاتھ سے مجبور

کبک و قمری کو رخصتِ پرواز
بال و پر مفتِ صعوہ و عصفور

جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں
اس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور

لذتِ مے سے جو نہ ہو آگاہ
اس کو کیا قدرِ خوشۂ انگور

جس کے آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے
روزِ روشن ہے یا شبِ دیجور

پہلے ہو گی کسی کو قدرِ ہنر
اٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور

دردِ دل کا بیاں کروں کس سے
بات کھونی نہیں مجھے منظور

سخنِ حق کی داد لوں کس سے
سن چکا ہوں فسانۂ منصور

دلِ آباد مفتِ بے ہنراں
ہو چکا خانۂ ہنر معمور

مژدہ خسرو کو وصلِ شیریں کا
ہو چکی سعیِ کوہکن مشکور

ہم نے دیکھی تمیزِ اہلِ نظر
ہم نے دیکھا مذاقِ اہلِ شعور

ہے غرض ان کو صوتِ موزوں سے
نالۂ دل ہو یا نوائے طیور

ہو کسی شے سے ان کی گرمیِ بزم
داستاں ہو وہ یا کہ درسِ زبور

ہے فقط روشنی سے ان کو کام
موم ہو اصلِ شمع یا کافور

ہے یہاں قائلِ انا مردود
ہو وہ فرعونِ وقت یا منصور

آپ اپنے سخن سے ہوں محظوظ
دلِ اصحاب گو نہ ہو مسرور

یاں اگر کام ہے تو شیریں سے
قصرِ خسرو کے اور ہیں مزدور

دلِ احباب پر نہیں چلتا
سحر میرا کہ رہیو غیر سے دور

ہوں تماشائے شہرِ نابینا
ہے برابر مرا خفا و ظہور

دُرِ یکتا ہوں اور ہوں بے آب
ماہِ کامل ہوں اور ہوں بے نور

چشمۂ بیدا و کارواں تشنہ
بادہ پُر زور و انجمن مخمور

اس زمانے میں وہ غریب ہوں میں
جو وطن سے ہو لاکھ منزل دور

صاحبِ قدر و جاہ ہے جب تک
کار فرما ہے چین میں فغفور

کاش اس عہد میں مجھے پاتے
تھا سخن جب کہ قبلۂ جمہور

کاش وھاں دیکھتے مجھے کہ جہاں
متنبّی تھا مادحِ کافور

کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز
انوری ہے نہ عرفی و شاپوؔر

کون دیکھے مرے چمن کی بہار
مر گیا عندلیبِ نیشا پور

جس سے ہوتا ہے خستہ سینۂ ہوش
ہے زباں میری وہ دمِ ساطور

جس سے ہوتا ہے کورِ پروانہ
ہے مری شمع میں وہ لمعۂ نور

شرحِ نقطہ کی گر کروں تحریر
تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور

ترکِ عشقِ بتاں کریں عشاق
مجھ سے سن پائیں گر ستائشِ حور

گر کروں ذکرِ لذتِ طاعات
تلخ کر دوں مذاقِ فسق و فجور

چھیڑ دوں گر فسانۂ فرہاد
دلِ خسرو میں ڈال دوں ناسور

کرنے جاؤں جو حق سے عذرِ گناہ
لے کے آؤں نویدِ عفوِ قصور

لوں ملائک سے داد حسنِ کلام
گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور

وہ شہنشاہ امتی جس کا
یاں گنہگار اور وہاں مغفور

وہ خداوند خدمتی جس کا
یاں سبکسار اور وہاں ماجور

مژدہ اے امتِ ضعیف کہ یاں
سعی ہوتی ہے بے کیے مشکور

لبِ شیریں کلام سے اس کے
دوست بھی شاد غیر بھی مسرور

اثرِ فیضِ عام سے اس کے
کعبہ آباد و مے کدہ معمور

چرخ کو دے اگر وہ حکمِ سکوں
ہو غلط نسخۂ سنین و شہور

صرصر قہر گر چلے اس کی
بند ہو مسلکِ صبا و دبور

جس طرف ہو وہ گرمِ نظارہ
جلوہ گر ہو ادھر سے لمعۂ طور

ہو جہاں لطف سے وہ سایہ فگن
موجزن ہو وہاں سے چشمۂ نور

بات پوچھو تو سوئے چرخ نگاہ
سینہ دیکھو تو علم کا گنجور

ہو سکے اس کی خوبیوں کا شمار
نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور

اے ترا پایہ فہم سے برتر
اے ترا نام عرش پر مسطور

میں ترے در پہ سن کے آیا ہوں
نام تیرا شفیعِ روزِ نشور

کچھ نہیں زادِ راہ پاس اپنے
مگر امیدِ عفو ربِّ غفور

طبع غالب ہے اور میں مغلوب
نفس قاہر ہے اور میں مقہور

بحرِ غفلت میں ہوں سراسر غرق
نشۂ کبر میں ہوں بالکل چور

چھوڑتی ہی نہیں خودی دامن
ہوں بہت اپنے ہاتھ سے مجبور

مہرِ فرزند و خواہشِ زر و سیم
طمعِ جاہ و فکرِ عیش و سرور

ایک بیمار اور سو آزار
ایک رنجور اور سو ناسور

نفسِ امّارہ اور دیو مرید
یہ ہے افعی تو وہ ہے کلبِ عقور

مجھ سے جو کام چاہیے لیجے
جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور

حسد و بغض و غیبت و بہتاں
بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور

ایک جو مجھ سے بن نہیں آتی
ہے وہ خدمت کہ جس پہ ہوں مامور

دل لگے بندگی میں کیا امکاں
لب ہلے ذکرِ حق میں کیا مذکور

مایۂ عقل ہے نہ شورِ جنوں
دلِ بے تاب ہے نہ جانِ صبور

نہ معاصی میں تلخیِ خجلت
نہ عبادت میں چاشنیِ حضور

فی المثل ہے مری مسلمانی
جیسے زنگی کا نام ہو کافور

ہاں مگر کچھ امید بندھتی ہے
تیرے زمرے میں گر ہوا محشور

جب ترے کارواں میں جا پہنچا
پھر رہا بابِ خلد کتنی دور

دوریِ آستانِ والا سے
ہے بہت تنگ حالیِ مہجور

اب دعا یہ ہے اے شفیعِ امم
بسکہ بے تاب ہے دلِ رنجور

جا لگے تیرے در پہ کشتیِ عمر
جب کروں بحرِ زندگی سے عبور

جیتے جی دل میں یاد ہو تیری
مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

قصیدۂ مدحیہ ناتمام

(نواب کلب علی خاں مرحوم رئیسِ رام پور کی شان میں)

ظلِ حق کلبِ علی خاں جس کے بذل و جُود پر
ہند سے لے تا عرب ہیں خاصی و عامی گوا

صاحبِ علم و عمل اور تابعِ احکام دیں
زائرِ قبرِ نبیؐ اور حاجیِ بیت الہدیٰ

شاعری میں فرد، موسیقی میں فارابیِ عصر
صوتِ روح افزا و صورت آیۂ صنعِ خدا

دولتِ برطانیہ پر اس کی فرزندی کا حق
دولتِ عثمانیہ کو اس سے پیوندِ ولا

اس کی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب اور جلیس
اور مروّت پر ہیں نازاں مجرم و اہلِ خطا

مرجعِ اربابِ علم و فن ہے اس کا بابِ فیض
یہ وہ دعویٰ ہے کہ خود دربار ہے اس کا گوا

گلزمینِ ہند میں تھے جو درختِ بار دار
ان کو چن چن کر یہاں لایا چمن بندِ سخا

گر مناظر ہیں تو ہیں سر دفترِ اہلِ کلام
اور محدث ہیں تو ہیں سر چشمۂ علم و ہدیٰ

زمرۂ اہلِ یقین، یا مجمعِ اہلِ سلوک
نکتہ چینانِ مجبطی خردہ گیرانِ شفا

شاعرِ شیریں نفس یا شاطرِ سنجیدہ رائے
فیلسوفِ متدل یا عارفِ علت ربا

بے بدل ہے الغرض جو روپ ہے اس باغ میں
بلبلِ جادو نوا ہو یا گلِ رنگیں ادا

بہرہ ور ہیں فیض سے تیرے بلادِ دُور دست
اے خوشا وہ سرزمیں جس پر ہو تو فرماں روا

بارِ محصولات سے یاں تک ہوئی ہلکی کہ اب
بارِ منت سے ترے پشتِ رعیت ہے دوتا

خیر تیری ہے حصارِ عافیت تیرے لیے
سیر ہو کر تجھ کو دیتے ہیں بہت بھوکے دعا

نعمتیں حق کی نہ سمٹیں گی سمیٹی زینہار
ہر بھلائی کی ملی دہ چند گر تجھ کو جزا

خوانِ نعمت پر ہے تیرے میہمانوں کا ہجوم
نام پھر زندہ ہوا خوانِ خلیل اللہ کا

ہے یقیں تجھ پر پڑے اصحابِ محشر کی نگاہ
جب کہیں کس نے کیا حق میزبانی کا ادا

دولت و اقبالِ روز افزوں سے تیرے ہے عیاں
جو کہ حامی قوم کے ہیں ان کا حامی ہے خدا

پرورش پاتی تھی جن کے سایۂ دولت میں قوم
لے گئی ان کو بہا کر موجِ سیلابِ فنا

کچھ گھرانے رہ گئے ہیں جو کہ آتے ہیں نظر
ہند میں اب تکیہ گاہِ امتِ خیر الوریٰ

یہ اگر بنتے نہ کشتیبان اس طوفان میں
کشتیِ اسلام تھی منجدھار میں بے ناخدا

رہ گئی تیری خریداری سے شرمِ اہلِ فضل
ورنہ ان کی جنس کا گاہک یہاں کوئی نہ تھا

مل گئے تھے گوہرِ درجِ شرافت خاک میں
خاک سے تو نے اٹھایا ان کو اور بخشی جلا

ہو رہے تھے دودمانِ علم و دولت جاں بہ لب
تو نے ایک اک کے چوایا حلق میں آبِ بقا

کول میں پودا لگا ہے جو پئے تہذیبِ قوم
آب یاری سے ہے تیری ہی اسے نشو و نما

ہے یہ وہ احسان جس کے بارِ منت سے کبھی
قوم کی گردن نہ ہلکی ہو گی بے روئے دریا

تیرے ظلِ تربیت میں گر رہا ہے یہ نونہال
ہے یقیں پھیلیں گی شاخیں اس کی طوبیٰ سے سوا

فرض اگر کیجے اسے دیوارِ کاخِ آرزو
تو وہ پشتیباں ہے جس سے اس کی قائم ہے بنا

اور اگر کہیے کہ ہے یہ قوم کی کشتِ مراد
تو ہے اس پر ابرِ رحمت کی طرح چھایا ہوا

قصیدۂ ناتمام مرقومہ ۱۲۹۴ھ

(سر سید احمد خاں دام بقاؤ ہم کی شان میں)

پنہاں نہیں ہے یارو سب پر کھلا ہوا ہے
جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے

ہے اک لکیر باقی جس پر فقیر ہیں ہم
خود سانپ ورنہ یاں سے کب کا نکل گیا ہے

اس پر بھی اے عزیزو ہے جائے فخر تم کو
دینوں میں دینِ بیضا حق نے تمہیں دیا ہے

قبلہ ہے وہ تمہارا جو گھر ہے سب سے پہلا
ہادی ہے وہ تمہارا جو ختمِ انبیاء ہے

دی ہے وہ مصلحِ کل حق نے کتاب تم کو
جس نے شریعتوں کو شیر و شکر کیا ہے

بخشی تمہیں حکومت حکمت تمہیں عطا کی
دوراں سدا موافق تم سے یونہی رہا ہے

اس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے

سر سبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے

وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے

وار اس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے
قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے

درہم سے اور قلم سے دم سے قدم سے اپنے
جو کچھ کیا ہے اس نے وہ کس سے ہو سکا ہے

ہمدردِ قوم ایسا ہم نے سنا نہ دیکھا
یہ درد اس کو جد کی میراث میں ملا ہے

تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی
ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

بعد از قرونِ اولیٰ کس نے کیا بتاؤ
سید نے کام آ کر جو قوم میں کیا ہے

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۲ھ

(مرثیۂ مہین برادرِ راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم)

کل سوگ میں بھائی کے اسے دیکھ کے چپ چپ
حالی سے کہا ہم نے کہ اے بحرِ معانی

خاموش کبھی ہم نے تجھے یوں نہیں دیکھا
کیا ہو گئی وہ تیری طبیعت کی روانی

شادی میں تری تہنیتیں ہم نے سنی ہیں
ماتم میں بھی دیکھی ہے تری مرثیہ خوانی

ہنسنا ہے نہ رونا ہے نہ بذلہ ہے نہ نوحہ
کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ہے ٹھانی

دنیا ہے یہ اک دارِ فنا جس کا اثاثہ
سب خاک سے تا انجم و افلاک ہے فانی

ہو جائے گر انساں یونہی ہر رنج میں خاموش
کس طرح دلوں کے ہوں عیاں رازِ نہانی

اک آہ بھری سن کے یہ حالی نے کہ جس سے
دل جل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی

فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ
ساحل پہ ہیں جو راہ سپر قاصی و دانی

حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی

پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی
غم بھائی کا مر جانے کی ہے اس کے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی

جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سایہ میں کٹی اس کی جوانی

شفقت نے دیا جس کی بھلا مہرِ پدر کو
دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی

جیتا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھانی

دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو
کیا ڈھونڈتے ہو اس کی طبیعت میں روانی

یہ چپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ
یہ چپ نہیں مر جانے کی ہے دل کے نشانی

بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں
یہ ناؤ ہے ہر طرح ہمیں پار لنگھانی

پر آہ کلی وہ جو ہے مرجھا گئی دل کی
مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپس میں کھلانی

باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۵ھ

(بجناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی)

آسماں جاہ کی خدمت میں یہ حالی کی ہے عرض
کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں

شکر ممکن نہیں اس کا کہ مجھے گھر بیٹھے
اس نے ممتاز کیا بھیج کے شاہی فرماں

نہ ہوئی مجھ سے کوئی خدمتِ سرکارِ نظام
نہ کیا میں نے کبھی طوفِ درِ صدرِ زماں

نہ کوئی مجھ میں ہنر ایسا کہ ہو لایقِ قدر
اور نہ ایسا کوئی جوہر جو ہو قیمت میں گراں

حق نہ تھا دولتِ عالی پہ کوئی حالی کا
جس کے جلدو میں وہ اس لطف کا ہوتا شایاں

ہاں مگر ذات میں ہے فیض رسانی جن کی
ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی حیلہ برائے احساں

ہیں مربّی ہنر و بے ہنری کے جس طرح
خار و گل دونو کو کرتا ہے نہال آبِ رواں

آسماں جاہ کا اک میں ہی نہیں شکرگزار
ملک میں اس کا ثنا خواں ہے ہر اک پیر و جواں

یہاں وہ ان کھیتیوں کو دے کے گیا ہے پانی
آنکھ اسلام کی خود جن کی طرف ہے نگراں

قوم اس وقت ہے تعلیم کی جتنی محتاج
ہے وہ عالم پہ ہویدا' نہیں محتاجِ بیاں

عزتؔ' آسودگی اور ملت و مذہب ان کا
ہو نہ تعلیم تو ہیں سب کوئی دن کے مہماں

پھر نہ قدر انکی کچھ آنکھوں میں خلائق کی بلند
اور نہ وزن ان کا ترازو میں حکومت کی گراں

آسماں جاہ پہ برکت ہو خدا کی جس نے
درد کا جان لیا ان کے کہ یہ ہے درماں

مدرسے قوم کے اس ملک میں جو ہیں ممتاز
جن میں کچھ کچھ نظر آتے ہیں ترقی کے نشاں

ان کی امداد سے نواب نے کی ہے قائم
چشمِ عالم میں مسیحائی پہ اپنی بُرہاں

کرتے ہیں زندۂ جاوید بنی نوع کو جو
بذل کرتے ہیں پئے تربیتِ اہلِ زماں

ہے مدارس کی اعانت وہ نکوئی جس کا
ملک پر قوم پہ تا دیر رہے گا احساں

یہی بخشش ہے یہی جُود ہے راس الحسنات
جس پہ موقوف ہے بہبودیِ نسلِ انساں

یہی امداد ہے جس سے ہوئیں قومیں سرسبز
یہی تدبیر ہے جس سے ہوئے ملک آباداں

یہی قوت ہے کہ ہوتے ہیں قوی جس سے ضعیف
یہی حکمت ہے کہ ہوتے ہیں سبک جس سے گراں

دی لگا ایک نے پانی کی سرِ راہ سبیل
کی ہمیشہ کے لیے ایک نے وھاں نہر رواں

اس کی خواہش تھی کہ ہوتے رہیں پیاسے سیراب
اس نے چاہا کہ رہے پیاس کا باقی نہ نشاں

برکتیں علم کی جو ملک میں پھیلاتے ہیں
نہرِ جاری سے ہے ذات ان کی بجوا فیض رساں

بخت اس ملک کے جس ملک میں ایسا ہو وزیر
حامیِ علم و خریدارِ کمالِ انساں

اب خدا سے یہ دعا ہے کہ جہاں میں جب تک
شکر احسان کا کرتے رہیں بعد از احساں

آسماں جاہ سے ہو تقویتِ ملکِ دکن
اور رہے ملکِ دکن ملجا و ماوائے جہاں

دولتِ قیصری و دولتِ آصف جاہی
ایک کی ایک زمانہ میں رہے پشتیباں

قصیدہ مرتبہ ۱۳۰۶ھ

(تہنیتِ عیدالفطر بہ جناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام سرکارِ عالی)

مہِ صیام گیا اور روزِ عید آیا
خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا

کیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے
کہ اپنے صبر کا انعام ہم نے پھر پایا

رہینِ منتِ ساقی ہیں بادہ خوار تمام
کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا

گئے ہیں ایسے مساجد سے معتکف خوش خوش
کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا

شگفتہ آتے ہیں اس طرح عید گاہ سے لوگ
کہ گنج انھوں نے ہے گویا خرابہ میں پایا

حسین چاؤ میں پھولے نہیں سماتے آج
کہ دن خدا نے نمایش کا ان کو دکھلایا

عزیز و دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم
خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج منوایا

حکیم ہیں مُتفکّر نہ زاہد افسردہ
خوشی نے دی ہے زمانہ کی کچھ پلٹ کایا

غنی ہیں شاں میں مست اور گدا ہیں کمال میں مست
ہے ایک خوان سے منعم نے سب کو چکھوایا

ادھر ہے فصلِ بہار اور ادھر ہے عیدالفطر
سماں نشاط کا ہے شہر و دشت پر چھایا

کھلے ہیں اس کے عوض دشت میں کروڑوں پھول
جو غم سے شہر میں آج ایک دل ہے کملایا

ہزاروں سرو خراماں ہیں شہر میں ہر سُو
جو دشت میں کوئی پودا ہے آج مرجھایا

اگر خوشی کا زمانہ کی ہے یہی عالم
تو سمجھو غم کا عوض غمزدوں نے بھر پایا

مگر یہ عاریتی انبساط ہے سب ہیچ
اس انبساط پہ غافل ہے جو کہ اِترایا

فریفتہ ہوئے جو ایسی ایسی خوشیوں پر
انہوں نے آب کا دھوکا سراب پر کھایا

خوشی ہے جس سے عبارت وہ ہے خوشی ان کی
جنہوں نے خلق میں ذکرِ جمیل پھیلایا

جنہوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما
جنہوں نے علم کا بجھتا چراغ اکسایا

جنہوں نے خلق سے اپنا بنایا غیروں کو
جنہوں نے لطف سے وحشی دلوں کو پرچایا

خبر مریضوں کی لی جاہلوں کو دی تعلیم
کھلایا بھوکوں کو بے پوشیوں کو پہنایا

ہوا زمین پہ جس سال آسماں ممسک
مینہ اپنی داد و دہش کا انہوں نے برسایا

ہوائے دہر اگر ہوگئی کبھی فاسد
فضائے دہر کو خلقِ حسن سے مہکایا

سدا غریبوں کی امداد پر ہیں جو تیار
لیا سنبھال اسے جس نے ہاتھ پکڑایا

ہمیشہ مانگنے والوں کو بے دریغ دیا
نہ مانگ سکتے تھے جو ان کے گھر پہ پہنچایا

نہ سمجھا آپ کو اک پاسبان سے بڑھ کر
انہوں نے لطفِ حکومت اسی میں کچھ پایا

نہ پائی کھانے میں لذت نہ چین سے سوئے
ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا

وغا میں شیر مگر وقتِ رحم مورِ ضعیف
کسی کی آہ سنی اور دل انکا بھر آیا

وہ سمجھے یہ کہ کوئی قافلہ ہوا تاراج
جو شاہراہ میں تنہا کسی نے کھڑکایا

وہ چونک اٹھے کہ گویا قیامت آ پہنچی
جو در پہ آ کے کوئی داد خواہ چلّایا

نشاط و عشرتِ جاوید کی ہے ان کو نوید
دل ایسا جن کو عنایت خدا نے فرمایا

سنا تھا کان سے جو ذکرِ خیرِ عہدِ سلف
سو آنکھ سے وہ وزیرِ دکن نے دکھلایا

بشیرِ دولت و دیں صدرِ اعظمِ اُمَرا
نہیں ہے جس کا کوئی قربِ شہ میں ہم پایہ

جو ظلِّ حق ہے رعیت کے سر پہ شاہِ دکن
تو اعظمُ الاُمَرا ظلِّ حق کا ہے سایہ

ہمیشہ جس کو ہے بہبودِ ملک مدِّنظر
رفاہ و امن ممالک میں جس نے پھیلایا

اٹھایا فتنہ نے جب سر فرو کیا اس کو
پڑا عمل میں جہاں عقدہ اس کو سلجھایا

بنائے نظم و نسق جس نے رکھی شوریٰ پر
مشیرِ کار خرد پروروں کو ٹھیرایا

دکن کو جس نے کیا مرجعِ خواص و عوام
دکن کا جس نے کہ ڈنکا جہاں میں بجوایا

نہ کوئی ملک میں سرکش رہا نہ نافرماں
جفا و ظلم کو توڑا' غرور کو ڈھایا

بل انتظام کے رشتہ میں پڑ رہے تھے بہت
سو تکلے کی طرح ایک ایک بل نکلوایا

لگا گئے تھے وزیرانِ رفتہ جو پودا
وہ صاحبی میں وزیرِ زماں کی پھل لایا

ترقی اب یہ تمدن میں کی ہے بلدہ نے
کہ اپنی حالتِ پیشیں سے خود ہے شرمایا

زمانۂ حال سے ماضی کو دیجیے کیا نسبت
اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکل آیا

خدا دراز کرے عمرِ اعظمُ الامرا
دکن کو جس کی حکومت نے دن یہ دکھلایا

زمیں پہ سایہ فگن جب تک آسمان رہے
رہے دکن پہ حضورِ نظام کا سایہ

تھی کوئی چیز نہ حالی کے پاس لایقِ نذر
سو یہ چکامۂ ناچیز پیشکش لایا

یہی بس اس کے لیے ہو گا مایۂ نازش
جو اعظمُ الامرا نے قبول فرمایا

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۸ھ

تہنیتِ ولادت فرزندِ ارجمند شبستانِ اقبال جناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام سرکارِ عالی

فیضِ ربِ ذوالمنن سے مژدہ اے اہلِ دکن
نائبِ دولت کا نخلِ آرزو لایا ثمر

دی بشیرِ دولت و دیں کو وہ چیز اللہ نے
جس سے پایا دیدۂ یعقوب نے نورِ بصر

جس کو پیری کا عصا سمجھا خلیل اللہ نے
حق نے دی جس کے عطا ہونے کی سارا کو خبر

جس کے ملنے سے ہوا داؤد ممنونِ قضا
جس کے پانے سے ہوا ایوبؑ مرہونِ قدر

جس کے بدلہ میں علیٰ ارغمِ شماتت پیشگاں
حق سے ختم الانبیاء نے پائے شبیرؑ و شبرؑ

جو بضاعت ہے گدا کی اور دولت شاہ کی
جو ہے حاصل عمر کا اور زندگانی کا ثمر

جس سے مستغنی ولی ہیں اور نہ عارف بے نیاز
جس سے ہیں اجداد زندہ اور اماجد نامور

صدرِ اعظم کو دیا صد شکر خالق نے خَلَف
خلق کی آخر دعاؤں کا ہوا ظاہر اثر

یہ پسر یا رَب بحقِّ عترتِ خیر الوریٰ
پائے عمرِ خضر زیرِ سایۂ مہرِ پدر

صدرِ اعظم کی طرح دربارِ آصف جاہ میں
جایگاہِ قربِ سلطانی ہو اس کا مُستقر

دولت و ثروت کو اس کی ذات سے لگ جائے شان
زیورِ علم و ادب سے ہو مجلّیٰ اس قدر

سیرت و عادت میں اس کی نکلے آن اجداد کی
جوہرِ اخلاقِ فاروقی ہوں اس میں جلوہ گر

ملک آصف جاہ میں سر آسماں جاہ اور وہ
رات دن رکھیں اجالا صورتِ شمس و قمر

قصیدہ مرتبہ ۱۳۰۹ھ

اے صفر کی دوسری روزِ دو شنبہ مرحبا
ہم نہ بھولیں گے کبھی وہ تیری صبحِ جانفزا

ہم نے رکھا آ کے جب بلدہ کی سرحد میں قدم
پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا

عزتِ قومی ترقی تھیں سدا آنکھیں جسے
اس کے کچھ آثار دیکھے ہم نے یاں شکرِ خدا

گھر میں جس فخر کے پھرتے تھے اک مدت سے ہم
آ کے بلدہ کے سوانح میں لگا اس کا پتا

بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے
جھولیاں ڈالے گلے میں دربدر دیتے صدا

پہنچے لینے ان کو وہ اعیان دارالملک سے
دولتِ عالی کو جن کی ذات پر ہے اتکا

قوم کو ہے جن پہ فخر اور ملک کو ہے جن پہ ناز
سلطنت کے جو ہیں اعضا اور وزارت کے قویٰ

صدرِ اعظم نے ہمیں بخشا اقامت کے لیے
وہ سرا بستاں خجل ہو جس سے جنت کی فضا

ہم غریبوں کو سمجھ کر اک سفارت قوم کی
دی وہ عزت شکر جس کا ہو نہیں سکتا ادا

پیشتر مہماں نوازی کا فقط سنتے تھے نام
آ کے یاں سمجھے کہ ہے مہماں نوازی چیز کیا

کی ہے نواب اقتدار الملک نے جو مرحمت
اس نے کلفت کو سفر کی دل سے بالکل دھو دیا

یہ مقولہ ہند میں مدت سے ہے ضرب المثل
جو کہ جا پہنچا دکن میں بس وہیں کا ہو رہا

ہے دکن کی وہ بھی شاید مسافر پروری
جو دکن میں آ کے دیتی ہے وطن دل سے بھلا

وارثِ ملکِ دکن ہے آج وہ محبوبِ خلق
نام پر دیتا ہے جس کے جان ہر چھوٹا بڑا

ہم کہ ہیں وکٹوریا کے مہدِ رافت میں پلے
امن و آزادی کی ہم نے کھائی ہے برسوں ہوا

جانتے ہیں ہم کہ چلتی ہے رعیت کس طرح
کس طرح ہوتے ہیں مقبول جہاں فرماں روا

کرتے ہیں کس منتر اور افسوں سے تسخیرِ قلوب
کس طرح بوتے ہیں دل میں خلق کے تخمِ وفا

کر لیا محکوم کے دل میں اگر حاکم نے گھر
تو یہ سمجھو حق حکومت کا کیا اس نے ادا

ہے یہی شاہِ دکن کی گلہ بانی کی دلیل
گلہ اپنے گلہ باں پر جان و دل سے ہے فدا

پوچھنے گچھنے کی اہلِ ملک سے حاجت نہیں
ان کی خوشحالی پہ ان کی تازہ رُوئی ہے گوا

دیکھتے آئے تھے جیسے راہ میں ہم سبزہ زار
خلق کو سرسبز دیکھا آ کے یاں ان سے سوا

راہ میں دیکھے تھے ہم نے کوہ اگر گردوں شکوہ
آ کے دارالملک میں دیکھے محل گردوں نما

عاملوں کی سخت گیری سے ہیں سب آزاد یاں
بینوا سے منعم اور منعم سے بڑھ کر بے نوا

اغنیا میں ہم وہ استغنا نہیں پاتے کہیں
جیسا بے پروا نظر آتا ہے یاں ایک اک گدا

جتنی یاں قومیں ہیں سب رکھتی ہیں باہم میل جول
بے تعصب بے تکلف بے تصنع بے ریا

ایک کے تہوار میں بے عذر ہیں سارے شریک
ایک کی تقریب میں ہمدم ہیں سب اور ہم نوا

دولتِ عالی نے حق سب کو برابر ہیں دیئے
ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں یاں دوسرا

پارسی، ہندو، مسلماں یا مسیحی کوئی ہو
ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا

ہم کو یاں کہنا تھا کچھ اور کہہ گئے بھولے سے کچھ
رہگور کی سیر نے منزل سے غافل کر دیا

قصہ کوتہ بار جب ہم کو ملا دربار میں
کہہ نہیں سکتے کہ بیداری تھی وہ یا خواب تھا

دیکھ کر اپنی رسائی تختِ آصف جاہ تک
واقعہ مور اور سلیماں کا ہمیں یاد آ گیا

حضرتِ والا نے جس شفقت سے کیں نذریں قبول
اس پہ گر جاں اپنی ہم قرباں کریں تو ہے بجا

جس توجہ سے سنی رودادِ قومی درس گاہ
شکر سے اس کے نہیں ہو سکتے ہم عہدہ برا

جب سے کالج کی علی گڑھ میں بنا ڈالی گئی
دولتِ عالی مدد کرتی رہی اس کی سدا

جو لگایا تھا درخت اس کی ہمیشہ لی خبر
دم بدم پانی دیا یاں تک کہ بار آور ہوا

اب کہ وقت آ کر پڑا تھا بانیِ کالج پہ سخت
دولتِ عالی نے شرطِ دستگیری کی ادا

مشکلیں جس طرح کی تھیں قوم کی اول بحل
کی اسی دریا دلی سے ان کی پھر حاجت روا

خود علی گڑھ کالج اور اس کے در و دیوار سب
راگ گائیں گے سدا احسانِ آصف جاہ کا

ہند میں باقی ہیں نسلیں جب تلک اسلام کی
جیتے جی ہوں گی نہ اس کے طوقِ منت سے رہا

کی ہے سرسید نے جو کوشش فلاحِ قوم میں
اس کو ہے اے اہلِ مجلس اک زمانہ جانتا

پر نیہ سرسید سے بیڑا پار ہونا تھا محال
دولتِ عالی اگر بنتی نہ اس کی ناخدا

تھا پڑا سید کا سچ پوچھو تو خشکی میں جہاز
دولتِ عالی نے اس خشکی میں گنگا دی بہا

ہے روایت جبکہ ہجرت کر کے ختم المرسلیں
پہنچے یثرن میں تو یہ ارشاد یاروں سے کیا

جس طرح ہوتی ہے بانبی سانپ کی جائے پناہ
ہو گا ملجا اب مدینہ بھی یونہی اسلام کا

ہے بلاتشبیہ دارالملک آصف جاہ بھی
ہند میں اب مرکزِ اسلام ہے رودریا

ذی لیاقت جتنے تھے ہندستاں میں انتخاب
دولتِ عالی نے چن چن کر لیا سب کو بلا

تربتیں اور خانقاہیں مدرسے اور مسجدیں
سب کی ہوتی ہے مدد اس گھر سے بے چون وچرا

حج بیت اللہ سے' جو ہر مسلماں پر ہے فرض
ہے دکن آنا مقدم شک نہیں اس میں ذرا

اول آنا چاہئے یاں استطاعت کے لیے
کیونکہ ہے بے استطاعت حج کو جانا ناروا

خرچ سے ہاتھ اک مسلماں کا ہو گر اتر میں تنگ
ہے دکن کی سمت وہ گردن اٹھا کر دیکھتا

خواب آتے ہیں دکن کے اس کو سوتے میں نظر
قوم کا بچہ مڈل سے جب ذرا آگے بڑھا

ہند میں کرتے ہیں کوشش جو رفاہِ خلق میں
اور مدد کو جن کی وھاں حاضر ہے ہر چھوٹا بڑا

چلتے چلتے ان کی گاڑی بھی اٹک جاتی ہے جب
کھینچنے کو اس کے جاتا ہے یہیں سے بینڈیا

ہے دکن کی اور مسلمانوں کی یارو وہ مثال
اک سمندر ہے کہ ہر سو جس میں ہے طوفاں بپا

تھا جہاز اک اس میں معمورِ اہلِ فضل و جاہ سے
لطمۂ امواج نے پرزے دیئے اس کے اڑا

ڈوبنے والے تھے جو وہ ڈوب کر اچھلے نہ پھر
بچ رہے ہیں جو وہ ہر سو مارتے ہیں دست وپا

کوئی کشتی یا جہاز آتا نہیں ان کو نظر
اس محیطِ بے کراں میں ایک زورق کے سوا

ہے وہ زورق فی المثل سرکارِ آصف جاہ کی
ہے مسلمانوں کو اب لے دے کے جس کا آسرا

ہے دعا جس وقت تک پانی سمندر میں رہے
یارب اس زورق کو تو موجِ حوادث سے بچا

ختم کر حالی سپاسِ صدرِ اعظم پر سخن
بال بال اپنا ہے جس کے شکر میں جکڑا ہوا

تقویت سے جس کی ہر مشکل ہماری حل ہوئی
انجمن کے منعقد ہونے کی دی جس نے رضا

پھر ادا کر جان و دل سے شکر صدرِ انجمن
جس کے قدموں میں یہ زیبا ہے کہ دیں آنکھیں بچھا

جس نے قومی انجمن میں بن کے صدرِ انجمن
قوم کو دی عزت اور انکی امیدیں دیں بڑھا

لے کے اذنِ صدرِ مجلس کیجیے پھر قصدِ وطن
ورنہ ہے حالی دکن کی دل فریب آب و ہوا

باندھ لیجے جلد اب رختِ سفر ڈر ہے کہ ساتھ
قافلہ سے چھٹ نہ جائے قافلہ سالار کا

قطعۂ مرتبہ ۱۳۰۹ھ

(بمقام حیدر آباد دکن)

یاں بلا کر دی ہے جو عزت ہمیں سرکار نے
اول اس کا شکر کرتے ہیں ادا اور بعد ازیں

خدمتِ والا میں ہیں اک عرض کرنی چاہتے
عرض کرنے کی اجازت ہو اگر اپنے تئیں

شاعری جس کو سمجھتے ہیں کمال ابنائے دہر
جو لیاقت اس میں ہے درکار وہ ہم میں نہیں

شکر کرنا تھا ہمیں سرکارِ عالی کا ضرور
چند نظمیں انجمن میں اس لیے ہم نے پڑھیں

گرچہ کی ہے کوشش ان نظموں کے لکھنے میں بہت
اور جگہ انگشت رکھنے کی نہیں چھوڑی کہیں

رہ گیا پر ہم سے اس کوشش میں باقی اک قصور
درگزر فرمائیں گے سرکار اس سے ہے یقیں

اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں مگر
جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ ان میں نہیں

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۹ھ بمقام حیدر آباد دکن

(در شکر اضافۂ وظیفہ بہ پیش گاہ جناب نواب سر آسماں جاہ بہادر)

اے بشیرِ دولت و دیں نائبِ شاہِ دکن
اے مہماتِ دکن کا ذات پر تیری مدار

مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے
شکر اس کا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار

جو کہ ہوتے ہیں جہاں میں بہرہ ور مقصود سے
پہلے ہو لیتے ہیں صد ہا مشکلوں سے وہ دوچار

کوئی دنیا میں نہیں ہوتی بغیر اس کے فتوح
ہے اسی پر کامیابی کا زمانے کی مدار

پر ملا مقصود جب حالی کو اس در سے ملا
بے تردد بے تذلل بے طلب بے انتظار

قدردانی گر زمانہ میں یونہی ہو جائے عام
پائیں بے مانگے مرادیں اپنی سب امیدوار

یارب اس سرکار کو ہے جس سے عالم فیضیاب
جب تلک دنیا رہے دنیا میں رکھیو برقرار

ترکیب بند مرتبہ ۱۸۹۱ء مطابق ۱۳۰۹ھ

(جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں بمقام علی گڑھ پڑھا گیا)

شکر اس نعمت کا یا رب کر سکے کیونکر زباں
تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں

جب ہوئے بھوکے تو بخشی تو نے نان و ناں خورش
پر نہ اتنی معدہ واحشا پہ جو گزرے گراں

جب ہوئے پیاسے تو بخشا آبِ شیریں اور خنک
پر نہ ایسا ہو صراحی جس کی یاروں سے نہاں

ڈھانکنا چاہا بدن جب تو دیا تو نے لباس
پر نہ ایسا جس کو حسرت سے تکیں خرد و کلاں

کھانے پینے کو کیے برتن ہمیں تو نے عطا
پر نہ ایسے ٹوٹنے سے جن کے ہو خوف زیاں

سونے اور آرام کرنے کو دیا بستر ہمیں
پر نہ ایسا جس سے اٹھنا ہو طبیعت پر گراں

رہنے سہنے کو دیئے گھر تو نے ہم کو ہر جگہ
پر نہ ایسے ہو تعلق جن سے مثلِ جسم و جاں

آنے جانے کو دیئے دو پانو یاں تو نے ہمیں
جن سے ڈرنے بھاگنے کا اور نہ گرنے کا گماں

راہ اور بے راہ یکساں جن کو ہنگامِ خرام
کوہ سدِراہ جن کا اور نہ خندق اور کنواں

کی سواری بھی عطا اکثر جو پیش آیا سفر
پر نہ ایسی تختِ فرعونی کا ہو جس پر گماں

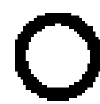
سیم و زر وقتِ ضرورت ہم کو تو دیتا رہا
پر نہ اتنا ہو نگہبانی میں جس کی بیم جاں

آبرو تو نے ہمیں دنیا میں دی اور امتیاز
پر نہ ایسی جس سے ہوں محسودِ ابنائے زماں

نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقت تو نے دیں
تا کہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہم پر عیاں

راحتیں اکثر میسر آئیں تکلیفوں کے بعد
تا کہ کھو بیٹھیں نہ ہم ان راحتوں کو رایگاں

وقت پر کرتا رہا بارانِ رحمت سے نہال
قحط اور طوفان دونو سے بچایا بال بال



الحذر اس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
لومڑی جاتے ہیں بن جس کی بدولت شیرِ نر

چاپلوسی جا کے کرتے ہیں سفیہوں کی فقیہ
ناکسوں کے نازِ بے جا سہتے ہیں اہلِ ہنر

وزن میں علم و فضیلت جن کے ہے ہم سنگِ کوہ
وہ سبک تر دانۂ خردل سے آتے ہیں نظر

فقر و حاجت میں نہ ہو انساں کو جب صبر و شکیب
پھر نہیں کوئی برائی فقر و حاجت سے بتر

بھیک منگوائے، جُوا کھلوائے، یہ چوری کرائے
پت گنوائے، آبرو کھوئے، پھرائے در بدر

ہو سکے محتاج سے طاعت زیادہ اللہ کی
لے سکے محتاج جورو کی نہ بچوں کی خبر

گہ زباں آلودہ اس کی شکوۂ تقدیر سے
اور کبھی بوچھاڑ اس کی آسمانِ پیر پر

گر بخیلوں کی مذمت پر کبھی آ جائے وہ
ہو نہ سبّ و شتم سے سیری اسے دو دو پہر

اگلے زہر اتنا کہ ہو جائے مذاقِ بزم تلخ
کھول دے غیبت کا دفتر اہلِ دولت کی اگر

گہ وبائے عام کی مانگے دعا اللہ سے
تا کہ دولت مند بھی کچھ دن رہیں آسیمہ سر

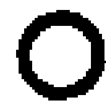
اور کبھی چاہے کہ ہو دنیا میں کوئی انقلاب
تا کہ ہو جائیں بلند اور پست سب زیر و زبر

بے حلاوت اس کی دنیا اور مذہب اس کا دیں
خوفناک اس کا ارادہ نیت اس کی پُر خطر

رات اس کی حسرت آگیں اور دن اندوہ گیں
شام اس کی پُر نحوست اور شوم اس کی سحر

گو کہ بدتر فقر سے یا رب نہ تھی کوئی بلا
تھا مگر ثروت میں اس سے بھی زیادہ شور و شر

فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعمت نہیں
پر نہ دی ثروت سوا اس کے شکر کی طاقت نہیں



نشۂ دولت کا تھا پھر ہوش میں آنا محال
اس مے مرد آزما کی تھی بہت مشکل سنبھال

نفسِ امارہ اور اس پر چھیڑ مال و جاہ کی
ڈھیر ہے بارود کا دیجیے پتنگا جس میں ڈال

بادِ صرصر آگ کو اس طرح بھڑکاتی نہیں
جس طرح جذباتِ نفسانی کو بھڑکاتا ہے مال

ہضم کرنا اور پچانا مال و دولت کا ہے بس
نفسِ انساں میں اگر بالفرض ہے کوئی کمال

ورنہ مال و جاہ و مکنت کا جہاں آیا قدم
اور ہوئے سلب آدمی سے آدمیت کے خصال

عقل ٹھیراتی ہے جو افعال انساں پر حرام
کردیے اس کے لیے سب مال ودولت نے حلال

فقر میں تھا نفسِ دُوں واماندہ جس پرواز سے
آ کے ثروت نے دیے پر واسطے اس کے نکال

خواہشیں یوں نفس میں اب دمبدم بڑھنے لگیں
مغز میں جس طرح دیوانہ کے گوناگوں خیال

آپکو گننے لگا بالاتر از اَبنائے جنس
چیونٹوں میں ایک نے گویا نکالے پَرّ و بال

مسرفِ بے زر ہو جیسے قرض خواہوں میں گھرا
خواہشوں میں اس طرح جکڑا ہوا ہے بال بال

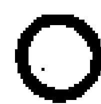
جھک پڑی طبعِ دنی گر بخل و خست کی طرف
ہو گئی فرزند و زن پر زندگی اس کی وبال

اور اگر بھوت اس کے سر پر چڑھ گیا اسراف کا
پھر نہیں گنجینۂ قاروں کچھ آگے اسکے مال

آ گیا غالب طبیعت پر گر استسقاے حرص
ہے سمندر سے بھی اس کی پیاس کا بجھنا محال

باڑ پر تلوار کی چلنا نہیں شاق اس قدر
جس قدر ثروت میں ہے دشوار پاسِ اعتدال

گلشنِ دولت کے ہوں انگور میٹھے بھی اگر
دیکھ اے روباہ نفسِ دوں حذر ان سے حذر



ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی
فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنہ سے بری

چین ہے دنیا میں گر کچھ تو اسی حالت میں ہے
یہ جو ہے برزخ میانِ مکنت و دست تہی

فقر و ثروت فی المثل ہوں دوزخ اور جنت اگر
مانگتے ہیں ہم حذر دوزخ سے اور جنت سے بھی

دخل شیطاں کا ہو جس میں ایسی جنت کو سلام
منزلِ اعراف سو بار ایسی جنت سے بھلی

اس کٹھن منزل میں ہے بنیا بھی اک بے خطر
ہیں ادھر کھڈ اور چڑھائی ہے ادھر البرز کی

رکھتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بین بین
ہیں حسد اور کبر کے امراضِ مہلک سے بری

اپنے سے اعلیٰ کی حالت پر اگر آتا ہے رشک
دیکھ کر ادنیٰ کو کر لیتے ہیں اپنی دل دہی

سن کے ہو جاتے ہیں سیدھے وہ بڑوں کا فخر و ناز
مل کے چھوٹوں سے بہک جاتا ہے گر خنا کبھی

لذتِ فقر و غنا دونو سے ہیں وہ آشنا
اغنیا میں ہیں فقیر اور ہیں فقیروں میں غنی

جو گزرتی ہے گدا پر اس سے ہیں وہ باخبر
کیونکہ حالت گاہ گاہ ان پر بھی گزری ہے یہی

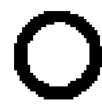
امتحاں دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوئے
کیونکہ ہے ہر گھونٹ میں اس مے کے بدمستی وہی

اس لیے جب دیکھتے ہیں عسرتِ ابنائے جنس
جوشِ ہمدردی سے بے کل ان کا ہو جاتا ہے جی

اور نہیں کرتے زبانِ طعن بے دردی سے وا
جب کہ سنتے ہیں کسی منعم کی از خود رفتگی

مست کی بے اختیاری تشنگی مخمور کی
واردات ایک ایک کی ہے سربسر ان پر کھلی

جنت اور دوزخ ہے سب اعرافیوں پر جلوہ گر
گندم اور زقوم دونو ان کے ہیں پیشِ نظر



دل توانا اور قوی یاروں کی ہمت ان سے ہے
منتظم ہر قوم و ملت کی جماعت ان سے ہے

مشکلیں اکثر انہیں سے قوم کی ہوتی ہیں حل
بھائیوں کے بازوؤں میں زور و طاقت ان سے ہے

ہے انہیں کے دم سے جو ہے گرمیِ ہنگامہ آج
ساری قومی مجلسوں کی زیب و زینت ان سے ہے

ہے جہاں دولت یہی ہیں نظم و دولت کے کفیل
ملک کی دولت میں ہے جو خیر و برکت ان سے ہے

ہاتھ میں ان کے ہیں جتنے عقل و دانش کے ہیں کام
عقل و دانش میں ہے جن ملکوں کی شہرت ان سے ہے

ہیں گداؤں کے وسیلے اور شاہوں کے مشیر
شاہ ہوں یا ہوں گدا دونو کو قوت ان سے ہے

آدمیت سیکھتے ہیں ان سے سب چھوٹے بڑے
نوعِ انساں میں بقائے آدمیت ان سے ہے

یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یاں
رونقِ بازار جنسِ علم و حکمت ان سے ہے

پاؤ گے ان میں طبیب ان میں ادیب ان میں خطیب
ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت ان سے ہے

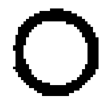
پاؤ گے ان میں مہندس پاؤ گے ان میں حکیم
آدمی مصداقِ رحمانی خلافت ان سے ہے

کرتے ہیں اخلاقِ ادنیٰ اور اعلیٰ ان سے اخذ
آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت ان سے ہے

ان میں قوموں کے ہیں مصلح ان میں ملکوں کے وکیل
آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت ان سے ہے

پھونکتے ہیں روحِ قومیت یہی افراد میں
ہے جہاں قوموں میں یکرنگی و وحدت ان سے ہے

دم سے ہے وابستہ ان کے قوم کا سارا نظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام



گر نہ ہو ہر حال میں ان کی مصالح پر نظر
ہیں مفاسد گرد و پیش ان کے فراہم سر بسر

کھیلتی ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زباں
ہے انہیں بھی شر سے یاں بچ بچ کے رہنا عمر بھر

گھاٹیاں فقر و غنا کی ان کے ہیں دونو طرف
اور رستہ بیچ میں ہے بال سے باریک تر

ایک جانب پستیِ فطرت ہے اور دوں ہمتی
ایک جانب مستی و غفلت ہے اور کبر و بطر

جھک پڑے گر اس طرف تو مفت کھو بیٹھے انہیں
وہ جو اڑنے کے لیے حق نے دیئے تھے بال و پر

ڈھل گئے گر اس طرف تو اس بلا میں پھنس گئے
جس میں پھنس جاتی ہے مکھی شہد میٹھا جان کر

برکتیں اللہ کی اس قوم پر جس قوم میں
رہ سپر یہ طبقۂ والا ہو سیدھی راہ پر

ہیں معطل اغنیا اور بے نوا کوتاہ دست
سب کی پڑتی ہے انہیں کے دست و بازو پر نظر

جو قویٰ ان کو ملے ہیں کام میں لائیں انہیں
تا کہ زندوں کی طرح ہو زندگی ان کی بسر

فرض ہیں جو ان کے ذمہ خالق اور مخلوق کے
ان میں سرگرداں رہیں دیوانہ وار آٹھوں پہر

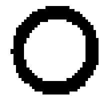
قوم ہو گر ناتواں تو تقویت بخشیں اسے
کیونکہ اس کے ضعف سے ہے ان کی قوت کو ضرر

گو نجات انساں کو مکروہاتِ دنیا سے نہیں
جن سے بچنا گوشت سے ناخن چھٹانا ہے مگر

کام دنیا میں سنوارے ہیں جنہوں نے قوم کے
تھے نکموں سے وہ مکروہات میں آلودہ تر

سارے بھگتاتے تھے بائیں ہاتھ سے دنیا کے کام
اور دائیں سے مہمیں قوم کی کرتے تھے سر

جس طرح اس انجمن کے رکن آئے ہیں تمام
قوم کی خاطر ہزاروں چھوڑ کر دنیا کے کام



قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جان آتی ہے مردوں میں وہ طاقت ہے یہی

اتفاقِ قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل
رائی کو کرتی ہے جو پربت وہ قوت ہے یہی

مال و دولت نامبارک ہے نہ ہو گر اتفاق
قوم جس دولت کی بھوکی ہے وہ دولت ہے یہی

یاں وکیل ایک اک ہے شہر اور ملک کا قائم مقام
دانہ کو کرتی ہے جو خرمن وہ برکت ہے یہی

رائگاں جائے گا یاروں کا نہ یہ رنجِ سفر
راحتیں جس کی طفیلی ہیں وہ زحمت ہے یہی

فرد فرد آتے ہیں جو جاتے ہیں یاں سے مجتمع
ملتے ہیں جس کی بدولت دل وہ ملت ہے یہی

تم ہمارے کام آؤ ہم تمہارے آئیں کام
جس سے کل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت ہے یہی

قوم کی خدمت میں ہے مضمر ربوبیت کی شاں
جو کہ پجواتی ہے خادم کو وہ خدمت ہے یہی

قوم کی ذلت کو سمجھیں ذلت اپنی سب عزیز
ملک میں عزت سے اب رہنے کی صورت ہے یہی

سال بھر رہتا ہے نقش اس انجمن کا یادگار
جو کبھی برہم نہیں ہوتی وہ صحبت ہے یہی

کر رہا ہے قوم کے سرکل کو یہ مجمع وسیع
جزر سے افزوں ہے مد جس کا وہ رجعت ہے یہی

اتفاقاً گر کبھی ہو جائے یہ ہنگامہ سرد
ڈر نہیں اس کا کہ خود قانونِ قدرت ہے یہی

ہے کبھی افراطِ باراں اور کبھی ہے قحطِ آب
طینتِ عالم میں خاصیت وَدیعت ہے یہی

کال ہے گر اس برس تو ہے سماں اگلے برس
جو خبر دیتی ہے کثرت کی وہ قلت ہے یہی

دیگ تو پکتے ہی یہ پکے گی دھیمی آنچ میں
کچھ ابال آیا تو ہے اس میں غنیمت ہے یہی

انجمن ہے قوم کی ہنگامۂ شادی نہیں
ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

مسدس مرتبہ ۱۳۱۰ھ

(مرثیہ جناب حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی)

اے جہان آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم

تھے ہنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم

زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علمِ دیں
جیسے اُمّی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں

ہند میں جو تھا محدث تھا وہ تیرا خوشہ چیں
تھی محدث خیز اے پا تخت تیری سر زمیں

تھا تفقہ بھی مسلّم تیری خاکِ پاک کا
بیہقیِ وقت تھا ایک اک فقیہ اس خاک کا

شاذ و نادر تھا تصوف میں کوئی تیرا نظیر
آب و گل کا تیرے تھا گویا تصوف سے خمیر

تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ مہرِ منیر
تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مستنیر

آج جس دولت کا بازارِ جہاں میں کال ہے
تیرا قبرستان اس دولت سے مالا مال ہے

طِب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آن کر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم

جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم
بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم

ہند میں جاری تجھی سے طِبِ یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

خاک سے اٹھے ہیں تیری جیسے نکتہ ور
اک جہاں شیوا بیانی سے ہے ان کی با خبر

راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سرو کو ہو گی نہ راس اتنی ہوائے کاشغر

حسنِ صورت میں اگر ضربُ المَثَل نوشاد تھا
حسنِ معنی تیرا حصہ اے جہان آباد تھا

لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم
جن میں تھی اسلامیوں کی چار سُو عالم میں دھوم

دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم
کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے ان کے جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں
تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام
تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہورِ انام

آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام
شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام

رسم میں آئین میں اوضاع میں اطوار میں
طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں

رہ گیا باہر سے آ کر جو کہ تجھ میں چند سال
ڈھل گئے سانچے میں گویا اس کے عادات اور خصال

آ کے بن جاتا تھا یاں نقصان، انساں کا کمال
تیرے پرچھاویں سے موتی بن کے جاتے تھے سفال

آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یاں
چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یاں

تیرا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب
آن کر لیتے تھے یاں تجھکو جہاں کے انتخاب

بستے تھے اطراف سے آ آ کے تجھ میں شیخ و شاب
کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب

جمگھٹا تھا تجھ میں ترک و فرس و روم و زنگ کا
دستہ تھا گویا کہ تو گلہائے رنگا رنگ کا

لیکن آخر طبعِ دوراں کا ہے جیسے اقتضا
ہر ترقی کی ہے حد ہر ابتدا کی انتہا

جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا
وقت اے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آ لگا

گردشِ افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار

تجھ پہ اے دار الخلافت انقلاب آنے لگے
غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے

طالعِ مشفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے
تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے

دولت و اقبال کا بندھنے لگا رختِ سفر
تجھ سے اے دارالعلوم اٹھنے لگا علم و ہنر

ہو گئے تیرے محدث راہیِ دارالسلام
کر گئے دنیا سے رحلت تیرے مفتی اور امام

ہو گیا رخصت جہاں سے تیرا جاہ و احتشام
رفتہ رفتہ ہو گئی سب صاحبی تیری تمام

مجلسیں برہم ہوئیں زیر و زبر دیواں ہوئے
خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے

چل دیئے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب
مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب

جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب
اس گلستاں سے نہ اٹھی پھر صدائے عندلیب

جن کو کھو بیٹھے نظیر ان کا کہیں پایا نہ کچھ
جو گیا اسکا کوئی قائم مقام آیا نہ کچھ

کر گئے اخلاق اور آداب سب تجھ سے سفر
گر گیا نظروں سے تیرا سب جلال و جاہ و فر

جھڑ گئے تاجِ شرف سے تیرے سب لعل و گہر
تجھ کو اے دارالخلافت کھا گئی کس کی نظر

علم ہے باقی نہ اب دولت ہے تیرے پاس وہ
اے گلِ پژمردہ تیری کیا ہوئی بو باس وہ

دورِ آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا
بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا

خاک نے یاں تیری پھر اگلے وہ لعلِ بے بہا
جن سے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا

عہد ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی
پر نہ کی عرضِ ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی

اس بزرگی سے گزاری تیرھویں تو نے صدی
پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویرِ دورِ اکبری

علمِ دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سُو ہر فن میں دھوم

ملک میں ہر سو وہی پھر بول بالا تھا ترا
تھا جہاں علم و ہنر گودوں کا پالا تھا ترا

تھی جہاں کچھ روشنی وہ سب اجالا تھا ترا
پھر جو دیکھا غور سے وہ اک سنبھالا تھا ترا

چاند نکلا تھا گہن سے جو وہ پھر گہنا گیا
چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا چھا گیا

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیئے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے

کچھ سخن ور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے
کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جلا کر چل دیئے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیلِ فنا اسکو بھی اے دلی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی
ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی

پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی
اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

تجھ میں ہے دلی! کوئی اب ایسا مقبولِ جہاں؟
نازشِ دارالخلافت مرجعِ ہندوستاں

ہند سے لے تا عرب کشمیر سے تا انڈماں
بچہ بچہ کی زباں پر نام ہے جس کا رواں

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب
خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زماں
واقعات زندگی کر دیجیے گر اس کے بیاں

سمجھیں اک افسانہ ناواقف اسے اور داستاں
ہے تعجب خیز الحق سیرتِ محمود خاں

یا وہ اک جوہر الگ تھا جوہرِ انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دارالشفا
خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا

مفت بیماروں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا
فکر نذرانہ کا تھا ان کو نہ شکرانہ کا تھا

اس کے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا

بے حقیقت اس نے سمجھا مال و دولت کو سدا
تھے برابر اسکے نزدیک اغنیا اور بے نوا

گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا
کوئی مفلس کا نہ تھا پرسانِ حال اس کے سوا

کرتے ہیں جو دعوئِ ہمدردیِ نوعِ بشر
اس نے باطل کر دیے تھے ان کے دعوے سربسر

طب مسلمانوں کی لی اس کی مسیحائی نے تھام
ورنہ اب تک اس کی ترکی ہو چکی ہوتی تمام

رونق طب جدید اور اس پہ میلِ خاص و عام
درس گاہوں اور دوا خانوں کا اس کے انتظام

دیکھ کر تھا اک زمانہ اس کی خوبی کا مقر
طب یونانی گئی تھی خلق کی نظروں سے گر

سرجنوں کے دیکھ دیکھ آلات و اعمال وحِیَل
آ گیا تھا رائے میں زود اعتقادوں کی خلل

دیں مگر اس کی مسیحائی نے سب رائیں بدل
طب یونانی گئی کچھ دن کو پھر گر کر سنبھل

سلطنت اور عقل تھی جس فوج کی ہمت فزا
ایک طاقت اس کے حملوں سے ہوئی عہدہ برآ

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں میں خاص و عام سب
پر الجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب

خلق کا پھر ملجا و ماویٰ اسی کا تھا مطب
اس کے بیماروں کو گو مایوس ہوں یا جاں بلب

سوءِ تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مہلک دوا کا ڈر نہ تھا

رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسا جس قدر
کرتے ہیں معلوم جو جو ان سے امراضِ بشر

وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھ کے انگلی نبض پر
اس کی اک انگلی پہ تھے قربان سو تھرمامٹر

نارسا تھیں دور بینیں اہلِ صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہِ دوربیں اس کی وہاں

شہر کے سب مرد و زن پیر و جواں خرد و کلاں
تھے قوی پشت اس سے ایسے جیسے پشتے سے مکاں

جس کو نسخہ دے دیا لکھ کر وہ یہ سمجھا کہ ہاں
زندگانی کے ابھی کچھ اور دن باقی ہیں یاں

گو کہ ماتم ملک میں ہے اس کا ہر سو آج کل
پر گئی اے شہر تیری جان ہی گویا نکل

کیا عجب، پیدا ہوں پھر ایسے طبیب اور چارہ گر
جو کہ تشخیصِ مرض میں رکھتے ہوں غائر نظر

خلق کو تکیہ ہو جن کی رائے اور تدبیر پر
شہر میں ہوں مرجعِ کل، ملک میں ہوں نامور

جمع ہوں محمود خاں کے، ذات میں ان کی، کمال
ہے یہ سب ممکن مگر محمود خاں ملنا محال

راستی اور راست بازی اس کی تھی ضرب المثل
اس کے کاموں میں ریا تھی اور نہ باتوں میں دغل

امتحاں کے وقت جب تھا نظمِ عالم میں خلل
راست بازوں کی گئی تھی ٹھیک جب ہر سو نکل

کھوٹ سے اس آنچ میں نکلا وہ خالص اس طرح
آگ میں تپ کر کھرا رہتا ہے کندن جس طرح

وہ زمانہ جب کہ تھا دلی میں اک محشر بپا
نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا

اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا
باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

موج زن تھا جبکہ دریائے عتابِ ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار
ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دو چار

یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرم سار
شہر میں تھی چار سُو گویا قیامت آشکار

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلے سے کہیں سب خشک و تر

ہو رہا تھا جب کہ کھوٹے اور کھرے کا امتحاں
کر رہا تھا اپنے جوہر خاک کا پتلا عیاں

ایک جانب تھی اگر خندق تو اک جانب کواں
بال سے باریک تر تھی راہ ان کے درمیاں

راہرو دگدا میں تھے اور راہ پُر خوف و خطر
اس نے دکھلایا کہ یوں چلتے ہیں سیدھی راہ پر

مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ
عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ

مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ
پر نہ تھا کوئی شفیع ان کا کہ جو تھے بے گناہ

ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اس نے کی
اہلِ انصاف اس کو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی

بایقیں جن ملزموں کو اس نے سمجھا بے خطا
مارشل لا میں ثبوت ان کی صفائی کا دیا

چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا
جو کہ تھے نادار کی ان کی اعانت برملا

زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا

قصے جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی خُو جس کی نہ تھی
دی گواہی جس نے ہرگز جھوٹی یا سچی نہ تھی

جس نے صورت تک عدالت کی کبھی دیکھی نہ تھی
ہاتھ سے جس نے بڑوں کی آن اب تک دی نہ تھی

بے گناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا
پانو ایک اس کا عدالت میں تھا اور اک گھر میں تھا

جبکہ عنقا تھی دیانت بینِ اَبناءُ الزّماں
تھی امانت جس کی اس کے پاس ہلکی یا گراں

خوف میں پاس اپنے رکھا اس کو مثلِ پاسباں
کی حوالے مالکوں کے جب ہوا امن و اماں

ایک عالم ناخدا ترسی میں جب بے باک تھا
اس کا دامن تھا کہ ہر دھبے سے بالکل پاک تھا

وضعداری میں نہ تھا اس کا زمانہ میں بدل
وضع میں اس کی تغیر تھا نہ عادت میں خلل

وقت کی تاثیر کا اس پر نہ چلتا تھا عمل
انقلابِ دہر کی زد سے گیا تھا وہ نکل

اس کے آگے ان نئے سانگوں کی کچھ ہستی نہ تھی
اس پہ چلتی کچھ زمانہ کی زبردستی نہ تھی

کی تھی جو بچپن سے طرزِ زندگانی اختیار
اس میں فرق آیا نہ وقتِ واپسیں تک زینہار

کوہِ راسخ کی طرح تھا ایک حالت پر قرار
وضع اس کی جو کہ تھی وضعِ سلف کی یادگار

قوم کے ازیادِ رفتہ خواب کی تعبیر تھی
عہد عالمگیر و اکبر شاہ کی تصویر تھی

سر پہ دنیا کے علایق کا تھا گو بارِ گراں
پر ہر اک حالت میں ہلکی پھول سی رہتی تھی جاں

پا بگِل دنیا میں پر دنیا کے غم سے برکراں
رنج ہو یا ہو خوشی جب جا کے دیکھو شادماں

ظاہراً پابند تھا دنیا کی رسم و راہ کا
دل مگر پایا تھا ایسا جیسا اہل اللہ کا

منقبض اس کو نہ مکروہات میں پایا کبھی
غم سے دنیا کے نہ پیشانی پہ بل لایا کبھی

دل کسی بادِ مخالف سے نہ کملایا کبھی
تلخیِ دوراں سے چتون پر نہ میل آیا کبھی

کی بسر دار المحن میں بزمِ عشرت کی طرح
عمر کاٹی دوزخِ دنیا میں جنت کی طرح

مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار
قوم میں جس کی مثال آئندہ کم دیکھیں گے یار

گل کھلائے گی نئے گلشن میں اب بادِ بہار
رنگ ہو گا جن میں لیکن بو نہ ہو گی زینہار

کرتے ہیں جب ان حوادث کے نظر انجام پر
قوم میں اک ہم کو سناٹا سا آتا ہے نظر

اک زمانہ تھا کہ تھا ہم سے موافق روزگار
اہل علم و فضل و دانش کا نہ تھا ہم میں شمار

ایسے حاصل خیز دنیا میں نہ ہوں گے کشت زار
جیسے مردم خیز تھے اسلام کے شہر و دیار

مرتا تھا کامل تو کامل تر نظر آتا تھا یاں
سورج آتا تھا نکل جب چاند چھپ جاتا تھا یاں

یا یہ اب پہنچی ہے ہم میں نوبتِ قحط الرجال
ایک اٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال

دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اس کی مثال
ذاتِ باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بے همال

ظاہراً اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی

داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم

نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

ترکیب بند مرتبہ ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۱۰ھ

(جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں بمقام دہلی پڑھا گیا)

یہ خاک آج جس پر ہیں جمع اہل آرا
یاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا

اس باغ میں بہاریں جو جو گزر چکی ہیں
آنکھوں کے روبرو ہے گویا سماں وہ سارا

کل جشن فتح تھا یاں ہے آج جشنِ شادی
ہر دم عروج پر ہے اسلام کا ستارا

بلبن کے آج مہماں خاقاں ہیں اور سلاطیں
اصطخر ہے کہ دلی بلبن ہے یا کہ دارا

فیروز شہ کی ہے کل ٹھٹھے سے آمد آمد
دولہا بنا ہوا ہے تزئیں سے شہر سارا

تغلق کا آج لشکر تیمور کے مقابل
بہرِ مدافعت ہے میدان میں صف آرا

مغلوں کے اڑ رہے ہیں کل جشن فتح و نصرت
تیمور سے زمانہ ہے برسرِ مدارا

آتا ہے آج بابر لودھی پہ فتح پا کر
ہیں شوقِ شاہِ نو میں پیرو جواں خود آرا

کل شوریوں میں ہر سو بجتے ہیں شادیانے
مغلوں کا آ رہا ہے گردش میں کچھ ستارا

ہے جشنِ فتح پھر آج چغتائیوں میں برپا
اقبال نے ہے گویا مغلوں سے قول ہارا

جس دھوم سے ہے گھر گھر جشنِ جلوسِ اکبر
ہے گرد اس کے آگے جشنِ قباد و دارا

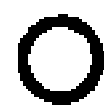
شاہِ جہاں خوشی سے پھولا نہیں سماتا
تعمیر ہو چکے ہیں شہر و فصیل وبارہ

طیاری اس خوشی میں جشنِ عظیم کی ہے
گویا کہ ہے جہاں میں جشنِ سدہ دوبارا

اطراف ہند سے ہیں اعیانِ ملک آئے
پا کر حضورِ شہ سے سب جشن کا اشارا

ارکانِ سلطنت ہیں سب پائے تخت حاضر
بالائے تختِ طاؤس ہے شاہ جلوہ آرا

وہ جشن کرنے والے گو خاک میں نہاں ہیں
پر جشن ان کے اب تک سب زیبِ داستاں ہیں



اے خاکِ پاکِ دہلی اے تخت گاہِ شاہاں
پیشِ نظر ہیں تیرے سب اگلے ساز و ساماں

ہنگامے اس زمیں پر لاکھوں ہیں گرم ہر سُو
پر کوئی جشنِ قومی آتا نہیں نظر یاں

تقریبِ جشن جس میں ہو کچھ نہ جُز اخوت
ملکوں سے جمع آ کر جس میں ہوئے ہوں اخواں

پائین و صدر کا ہو جس میں نہ کچھ تفاوت
خُرد و بزرگ کی ہو جس میں نشست یکساں

جن کو نہ ہو بلاوا حاکم کا اور نہ قدغن
لایا ہو کھینچ کر دل ان کو نہ حکمِ سلطاں

خادم ہوں جس قدر وھاں مخدوم قوم کے ہوں
مخدوم جتنے ہوں وھاں سب قوم پر ہوں قرباں

خاطر کسی سے چاہے کوئی نہ وھاں تواضع
ہوں خود ہی میزباں وہ اور خود ہی ہوں وہ مہماں

ٹھیرائیں جس کو چاہیں وہ آپ میرِ مجلس
چاہیں جنہیں بنائیں وہ آپ میرِ ساماں

آئے ہوں اس غرض سے سب مل کے تا کہ سوچیں
دنیا میں کس طرح ہوں سرسبز پھر مسلماں

ہندوستاں میں کیونکر باقی رہے نشانی
اس قوم کی کہ تھا کل جن کے وہ زیرِ فرماں

نکلیں تو کیونکہ نکلیں ذلت سے وہ گھرانے
اعزاز نے تھا باندھا جن کے بڑوں سے پیماں

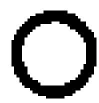
ان مدرسوں کا کیونکر جاری رہے افاضہ
جن کے سبب ہے زندہ نامِ حدیث و قرآں

جو مسجدیں ہیں ببرِ ذکر خدائے واحد
محفوظ حادثوں سے کیونکر ہوں ان کے ارکاں

جو کچھ ہے بھائیوں کی تقدیر میں وہ سر پر
اپنی طرف سے لیکن ہے سعیِ فرضِ انساں

اے شہ نشینِ اسلام اے معدنِ سلاطیں
اے پایۂ تختِ سادات اے دارِ ملکِ مغلاں

تو جشن گاہِ شاہاں ہر عہد میں رہا ہے
ایسا بھی جشن کوئی تجھ میں کبھی ہوا ہے



شاہوں کے جشن تھے وہ یہ جشن قوم کا ہے
شوکت میں وہ بڑے تھے عظمت میں یہ بڑا ہے

دولت کے تھے وہ جلوے ملت کا ہے یہ نقشہ
کاغذ کی تھی وہ ناویں بیڑا یہ نوح کا ہے

بے روح تھے وہ قالب ہے اس میں روح خویشی
موجِ سراب تھے وہ یہ چشمۂ بقا ہے

میلے نہ وہ بچھڑتے روح ان میں گر یہ ہوتی
رہتا ہے آندھیوں میں روشن یہ وہ دیا ہے

وہ دن گئے کہ نازاں تھی قوم سلطنت پر
اب قوم کو خدا کا یا اپنا آسرا ہے

بس سلطنت یہی ہے مل بیٹھنا ہمارا
یہ چھت نہ سمجھو سر پر یہ سایۂ ہما ہے

گم گشتہ بخت جس کو پھرتے ہیں ڈھونڈتے ہم
لگتا ہے کچھ تو اس کا لگتا یہیں پتا ہے

وہ مشکلیں کریں گے اب حل ہمیں تمہیں کچھ
جن مشکلوں کا ہم کو اور تم کو سامنا ہے

ہم میں اگر مخالف کچھ ہوں اس انجمن کے
معذور ہیں وہ ان سے شکوہ نہ کچھ گلا ہے

فوجِ کمک کو اکثر سمجھا ہے فوج دشمن
حملہ کمک پہ اپنی اپنوں نے خود کیا ہے

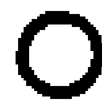
نادم ہوئے ہیں لیکن روشن ہوا ہے جب دن
انساں سے یہ ہمیشہ ہوتی رہی خطا ہے

قدر ایسی مجلسوں کی مدت میں ہو گی ہم کو
اب تک ضرورتوں نے مضطر نہیں کیا ہے

ہوتی ہے قدر ان کی بنتی ہے جان پر جب
لاتے ہیں تب یہ ناویں جب بیڑا ڈوبتا ہے

گو سب جہاز والے خطرے سے بے خبر ہیں
پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو رہا ہے

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر روتا ہے ناخدا جب



گلشن میں فصلِ گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں
پر چین سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں

طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں
اور بیٹھے ہاتھ ملتے گلچین و باغباں ہیں

غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی
بے فکر و بے خبر ہیں بوڑھے ہیں یا جواں ہیں

اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخَلَف ہیں
رستہ کدھر ہے ان کا اور جا رہے کہاں ہیں

فضل و کمال ان کے کچھ تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا
کچھ کر۔ لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

تم سے تھے تو تھا موعزت کو قوم کی کچھ
اپنے تو قافلے سب پادر رکاب یاں ہیں

اک خضرِ رہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے
رستے پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں

خدمت میں ہان کی حالی کہتا ہے یہ ادب سے
اس وقت رونق افزا یاں جتنے مہرباں ہیں

دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں

عرصہ ہوا کہ ہم کو آنکھیں دکھا رہے ہیں
قدرت کے قاعدے جو دنیا پہ حکمراں ہیں

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں

گھڑیال اور مگرمچھ ہیں ان کو نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

سنبھلو وگرنہ رہنا یاں اس طرح پڑے گا
بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بے نشاں ہیں

یہ غفلتیں مبادا اب روزِ بد دکھائیں
دھندلے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹ نہ جائیں

اشعارِ متفرقہ

ان میں اکثر وہ اشعار ہیں جو لوگوں کی فرمائش سے خاص خاص موقعوں پر اردو یا فارسی وغیرہ میں لکھے گئے ہیں

تمہید رقعہ شادی عروسی

شکر کیجیے کون سی نعمت کا خالق کی ادا
ایک سے ہے ایک نعمت اس کی بندوں پر سوا

اسکی قدرت کے خزانوں میں نہیں ہرگز کمی
جس نے جو مانگا وہی اس نے مہیا کر دیا

نخل تر کو پھل دیا اور پھل کو بخشا رنگ و بو
سیپ کو موتی دیا موتی کو دی آب اور ضیا

کھیتوں کو مینہ دیا ماں باپ کو اولاد دی
اس سے دی دنیا کو رونق اس سے آنکھوں کو جلا

عمر روز افزوں عطا فرمائی پھر اولاد کو
کل چھٹی تھی جن کی ہے دن آج ان کے بیاہ کا

آؤ اس کے شکر میں سب مل کے باہم شاد ہوں
تا کہ صورت سے ہو ظاہر شکرِ انعامِ خدا

ایضاً

چھٹی۔ بیاہ یا تیج تہوار ہو
لبِ آب یا صحنِ گلزار ہو

گل و لالہ ہو یا ہو عطر و گلاب
مے و نغمہ ہو یا ہو چنگ و رباب

یہ سارے خوشی کے ہیں سامان جب
کہ ہوں ایک جا جمع احباب سب

بزرگوں سے محفل کی شوکت بڑھے
عزیز اور پیاروں سے عزت بڑھے

جہاں اس طرح جمع ہوں چار یار
ہیں اس بزم پر لاکھ گلشن نثار

ایضاً

شکر کہ از فضلِ خدائے جہاں
وقت خوش از پردہ بر آمد عیاں

شادیِ دل را سبب آمد بدست
فرصتِ بزمِ طرب آمد بدست

تا شود از مقدمِ اہلِ کرم
کلبۂ ما غیرت باغ ارم

ایضاً

رفت آسیبِ زمستاں بادِنو روزی وزید
دوستداراں رابشارت بادو یاراں رانوید

طرح بزمِ خرمی باہم دگر باید نہاد
نغمۂ شکر الٰہی دم بدم باید کشید

ایضاً

سلامٌ من مُحِبٍّ مستکینٍ
یلیه الخیر والبُرکاتُ تتریٰ

سلامٌ رِدْفُہٗ رَوْحٌ وَرَاحٌ
وَبَیْنَ یَدیہِ لِلاَحبابِ بُشریٰ

وَدَعْوةُ شَاھِدِیْن وَغَائِبِیْنا
مِنَ الاِخْوانِ وَالْخلاّنِ طُرّاً

خاتمہ رقعہ شادی

فَاَطْیَبُ الْعَیشِ فِي الدُّنیا وَاَرْغَدہٗ
رَھِیْنَۃٌ بِزِیَارَاتِ الْاَحِبّآءِ

ایضاً

ہزار دیدہ و دل فرشِ راہِ یارا نے
کہ از مسرتِ یاراں مسرت اندوزند

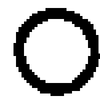
بہ شادی و طربِ ہمد گر شوند انبار
ہزار رخ زفروغِ دلے بر افروزند

ایضاً

کارِ احباب ساختن بتواں
دوستاں را نو اختن بتواں

تابہ دہر ابر و باد خواہد ماند
از شما لطف یاد خواہد ماند

اشعارغزل ناتمام



اس زندگی کے ہاتھوں چین ایک دن نہ پایا
یہ جان ہے بدن میں یا خار پیرہن میں

حاضر ہو جب نہ دل ہی ہے باغ وراغ یکساں
ہم دوستو گئے بھی تو کیا گئے چمن میں

ہے اک خراش دل میں ڈر ہے کہ بھر نہ آئے
زخمی ہے قیرواں میں اور مشک ہے ختن میں

تو اپنے بھولے پن سے شیدا ہوئی ہے ورنہ
اے فاختہ دھرا ہے کیا سرو نارون میں

ایضاً

کس قدر یارو ہوا ہے انقلاب
آ گیا یاروں کے اقراروں میں فرق

خود بتا دے گا تمہیں دورِ زماں
بے وفاؤں اور وفاداروں میں فرق

ان پہ ہم قرباں ہیں وہ ہم پر نثار
ہے بہت پیاروں میں اور یاروں میں فرق

ایضاً

گر نہ ہو نیتِ گدا میں فرق
آئے کیوں شاہ کی عطا میں فرق

ہیں وفادار اور بھی لیکن
ہے مری جاں وفا وفا میں فرق

اشعارِ قصیدۂ ناتمام

یادِ ایام کہ تھی باغ جوانی پہ بہار
نظر آتا تھا خزاں میں بھی زمانہ گلزار

نشہ میں چور تھے اک بادۂ پر زور کے ہم
جس کا راحت میں نہ کلفت میں اترتا تھا خمار

سر پہ وہ دیو قوی آ کے چڑھا تھا اپنے
یاد تھا جس کا نہ عامل کو نہ سیانے کو اتار

روکتا تھا نہ جسے غار نہ خندق نہ کُواں
تھے ہم اس توسنِ سرزور پہ دن رات سوار

رہتے تھے اس شترِ مست کی صورت بے قید
ہاتھ سے جس نے شترباں کے تڑالی ہو مہار

پند گو ہوتے تھے جتنے کہ زیادہ دل سوز
ان کی صحبت سے تھے اتنے ہی زیادہ بیزار

خیر خواہ اور تھے غمخوار، مربی جتنے
ان کی صورت سے ہمیشہ ہمیں چڑھتا تھا بخار

مل کے ہم جولیوں سے جان میں جان آتی تھی
ہنسنے اور بولنے پر زیست کا تھا اپنی مدار

اب امنگیں ہیں وہ دل میں نہ ترنگیں باقی
تیرے اے عمر گئے اب وہ کہاں لیل و نہار

صدائے گدایانِ قوم

ڈھونڈنے خضر مبارک پے کو یاں آئے ہم
چھوڑ کر بھٹکا ہوا اک کارواں آئے ہیں ہم

ڈر ہے جو خوش دل ہیں وہ سن کر نہ ہوں پژمردہ دل
سخت عبرت خیز لے کر داستاں آئے ہیں ہم

ہند میں اسلام کا پھولا پھلا تھا جو چمن
لے کے اس کا مژدۂ فصلِ خزاں آئے ہیں ہم

علم جو زندہ کیا تھا آپ کے اجداد نے
آج اس در پر اسی کے نوحہ خواں آئے ہیں ہم

قوم کھو بیٹھی ہے جو عباسیوں کی یادگار
جستجو میں اس کی مشعل لے کے یاں آئے ہیں ہم

تا کہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا
اس لیے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم

خود غرض ٹھیرائیں یا مکار ہم کو یا گدا
ذلتیں یہ کر کے سب خاطر نشاں آئے ہیں ہم

فخر سب بے جا ہیں ان کے قوم ہے جن کی ذلیل
فخر و عزت کے مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم

ہے بنی ہاشم کی مہماں پروری ضربُ المَثَل
اس لیے یاں بن بلائے میہماں آئے ہیں ہم

تشنگی اپنی بجھانی ہو گی اے آبِ حیات
لے کے منہ میں قوم کی سوکھی زباں آئے ہیں ہم

مژدہ قدوم حضور شاہزادہ ویلز در ہند

مژدہ ہو اہلِ مشرق اب دن پھرے تمہارے
مغرب سے سوئے مشرق آیا ہے مہرِ تاباں

گلّہ کی اپنے لینے آیا خبر کہاں سے
ہے ایسے گلّہ باں پر گلّہ کی جان قرباں

ہندوستاں بھی تجھ سے کچھ آج کل نہیں کم
اے معدنِ بزرگی اے خاکِ انگلستاں

تیرے نصیب کا تو کیا پوچھنا ہے لیکن
ہندی بھی ان دنوں ہیں قسمت پہ اپنی نازاں

مہماں ہے آج ان کا اس شاہ کا ولی عہد
روئے زمیں کے سلطاں جس کے ہوئے ہیں مہماں

شکریہ عطائے مدرسۂ نواب غازی الدین خاں مرحوم واقع اجمیری دروازہ دہلی بحضور سر جمیس لائل لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب از طرف طلبائے اینگلو عربی سکول دہلی

آیئے اے دلی کے دل آرا　　شہر دعا گو سب ہے تمہارا
شکر کا ہم کو گو نہیں یارا　　پر ہے یہ کہنا فرض ہمارا

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

ہے دلی کے فخر کا یہ دن　　شہر میں آیا شہر کا محسن
وصف تمہارا گو نہیں ممکن　　رہ نہیں سکتے پر یہ کہے بن

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

آپ نے ہم پر بھیجے ہیں افسر　　کیسے کیسے رعیت پرور
جن سے ہے ہندوستان منور　　فخر ہے انگلستان کو جن پر

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

آرکلاک احسان کا پتلا
آدمی کی صورت میں فرشتہ
تھا دلی پر فضل خدا کا
تم نے جو دلی میں اسے بھیجا

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

آب و ہوا سے شہر کی ساری
آئی تھی خلقت جان سے عاری
تم نے لگا کر نل اک باری
چشمۂ حیواں کر دیا جاری

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

یوں تو ہیں سب احسان مسلّم
سب سے ہے یہ احسان مقدم
تھے تعلیم میں کم سب سے ہم
تم نے مدد کی اپنی پیہم

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

جوبلی کے جو خاص وظیفے
پانچ برس کو ہم کو ملے تھے
لطف سے میعاد ان کی بڑھا کے
جیت لیے دل آپ نے ہم سے

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

مدرسہ تھا بے ٹھور ہمارا
تھا نہ کہیں ٹکنے کا سہارا
مانگے تانگے پر تھا گزارا
مٹ گیا اب خلجان یہ سارا

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

آپ کو ہم پر رحم جو آیا — گھر یہ عطا ہم کو فرمایا
حکم مرمت کا بھجوایا — ٹوٹے پھوٹے کو بنوایا

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

درس کے کمرے جس میں ہیں اکثر — قدرِ ضرورت سے کچھ بڑھ کر
بورڈوں میں رہنے کو ہیں گھر — کھیلنے کو میداں ہے سراسر

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

شہر میں جا کالج کو عطا کی — کیں اصلاحیں آب وہوا کی
شہر کی جو حاجت تھی روا کی — شرط حکومت تم نے ادا کی

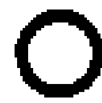
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

تم میں ہیں جو موجود فضائل — وہ نہیں کچھ محتاجِ دلائل
لوگ سب ان کے دل سے ہیں قائل — او! سر لائل او! سر لائل

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

اشعارِ مدحیہ

(بحضور سر ڈینس افنز پیٹرک لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب انبالہ کے ایک بانی مدرسہ کی طرف سے)



قیصر ہند کے ہیں سیکڑوں احسان جہاں
اس کا پنجاب پہ ہے سب سے بڑا یہ احساں

حکمراں آئے ہیں پنجاب میں اب تک جتنے
ایک سے ایک کا پلہ ہے عدالت میں گراں

جبکہ سر چارلس نے پنجاب کو چھوڑا اس دم
وقت رخصت تھا ہر اک ان کو بہ حسرت نگراں

حال جو ہوتا ہے بچوں کا بچھڑ کر ماں سے
یہی احوال تھا پنجاب کا بے وہم و گماں

جانشیں ان کے ہوئے آن کے جب سر لائل
عہد سابق کو گئے بھول سب ابنائے زماں

شکر سے عہدہ برآ اس کے نہیں ہو سکتے
رحم و انصاف ہوا ذات سے جو ان کی عیاں

اٹھ گیا سر سے جب اس ملک کے سایہ ان کا
ہاتھ میں آپ نے لی آ کے حکومت کی عناں

کار فرما تھے جب اضلاع میں پنجاب کے آپ
معدلت آپ کی اس وقت سے مشہور ہے یاں

حیدر آباد میں، میسور میں، کلکتہ میں
نیک نامی کے کیے کام، رہے آپ جہاں

ہے یہ اب آپ سے امید کہ پنجاب میں بھی
مشکلیں آپ سے سب ملک کی ہوں گی آساں

بعد سر لائل و سر چارلس کے سر ڈینس بھی
چھوڑ جائیں گے ہر اک دل پہ عقیدت کے نشاں

انگریزی اشعار کا ترجمہ

وہ دل ربا امیدیں جن پر کہ تو ہے شیدا
جب دُور تیرے دل سے ہو جائیں گی سراپا

وہ عالمِ جوانی جس پر کہ تو ہے مفتوں
جائے گا ٹوٹ جس دم اس کا طلسم سارا

جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تو نے اس کو
تھا جو کہ تجھ کو اپنا آرامِ دل سمجھتا

چل دیں گے جب وہ سارے ان بلبلوں کی مانند
بعد از بہار جو رخ کرتیں نہیں چمن کا

جب ہو چکے گا آخر یہ عیش کا زمانہ
کون آ کے دے گا تجھ کو اس کے سوا سہارا

بے مہریوں سے تو نے جس کو کیا ہے غمگیں
تیری خبر وہی کچھ لے گا تو آ کے لے گا

جس طرح وہ پرندہ جو فصلِ گل میں جا کر
پھر موسمِ خزاں میں آ کر ہے ہم سے ملتا

دولت اور وقت کا مناظرہ

ایک دن وقت نے دولت سے کہا — سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایۂ عزت یا میں — تو ہے انسان کی دولت یا میں
ہے زمانہ میں بڑی بات تری — دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا — تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا
ہے عجب، جس کو خدائی مانے — اس کی تو خوبیوں میں شک جانے
سبز ہے گلشنِ دنیا مجھ سے — لیتے ہیں توشۂ عقبیٰ مجھ سے
نام اقبال ہے آنے کا مرے — لقب ادبار ہے جانے کا مرے
مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو و نما — علم بھی ایک طفیلی ہے مرا
لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال — لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر — میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدرِ بشر
چند روز آ گئی میں جس کے کام — زندہ تا حشر رہا اس کا نام
جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا — وہ سدا خوار و نگوں سار رہا
منہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں — اس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں

چاہتے ہیں مجھے سب خُرد و کلاں — پھرتے ہیں دھن میں مری پیر و جواں

گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو — کسی آغاز کا انجام نہ ہو

کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا — درمیاں گر نہ قدم ہو میرا

ہیں رکھائی سے مری سب لرزاں — میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں

جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں — ہو اگر شیر تو روباہ کروں

الغرض ہے مری وہ شانِ عظیم — کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو — میری عظمت نہیں باور تجھ کو

تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا — جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا

وقت نے سن کے کہا اے دولت — شک نہیں اس میں ذرا اے دولت

ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے مگر — اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر

تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی — اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی

کیجیے فرض تجھے گر چشمہ — تو ہوں اس چشمہ کا میں سرچشمہ

میں ہوں یا تو ہے اساسِ امکاں — پہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں

تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں — تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں

ہے قرابہ ترا گر عطر آگیں — میں ہوں اس عطر کی واللہ زمیں

ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال — تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دستِ قدرت

لاکھ مار ان سے اگر بھاگے تو — بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

ان کی مٹھی میں ہے تواے دولت
طائرِ رشتہ بپا کی صورت

نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود
جس کا نایاب ہے عالم میں وجود

کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر
جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر

ایک پل میری اگر دیجیے گنوا
لیجیے ہاتھ اس سے ہمیشہ کو اٹھا

تو اگر اپنی لٹا دے ثروت
پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت

ہیں اسی واسطے جو اہلِ تمیز
میری ایک ایک پل ان کو ہے عزیز

میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس
ہے مراجاگتے سوتے انہیں پاس

جانتے ہیں حکما و عرفا
مجھ کو سرمایۂ دین و دنیا

دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں
ان کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں

نہ کوئی کام ہو ان سے انجام
نہ ارادہ ہو کوئی ان کا تمام

نہ انہیں دین کی دولت ہاتھ آئے
اور نہ دنیا کبھی ان سے پٹپائے

نہ ادا صوم ہو ان سے نہ صلوٰۃ
نہ ہو قدرت میں حج ان کی نہ زکوٰۃ

نہ مدد ان سے کچھ اپنی کی جائے
نہ خبر ان سے کسی کی لی جائے

گن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت
ہے مگر تنگ مجالِ فرصت

بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو
بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اس میں ہے میرا سراسر نقصاں
کہ ہے انمول مری ایک اک آں

ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے

ہے لیاقت جن میں کچھ قدر قلیل
اور سمجھتے آپ کو ہیں بے عدیل

ان کو ایسوں سے نہیں ملنا روا
جو لیاقت رکھتے ہیں ان سے سوا

اونٹ اگر سمجھے بڑا اپنے تئیں
دیکھنا لازم پہاڑ اس کو نہیں

سر میں ہے جگنو کے یہ سودا اگر
شے نہیں مجھ سے کوئی تابندہ تر

چاہیے دن کو نہ نکلے زینہار
ورنہ ہوگا اپنے جی میں شرمسار

قطعاتِ تاریخ اور تاریخی جملے مقتبس از قرانِ مجید

راقم کو فی الواقع تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقت سے اکثر تخرجہ یا تعمیہ کے ساتھ اور کبھی حسن اتفاق سے بغیر اس کے بھی تاریخ سرانجام ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادہ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اس پر مصرف مصرعے لگا کر تاریخ کے خود مالک بن بیٹھے لیکن چونکہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جزو شاعری سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر طوعاو کرہا یاروں کی فرمایش سے اور کبھی کبھی اپنی اپج سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں۔

ایک بزرگ کے پاس لوگ اکثر تعویذ گنڈے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے کہ عباسیوں کے عہد میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ لوگ ایک قفل کو بند کر کے اس کے پاس لے گئے کہ اگر تو فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ تو یہ قفل بغیر کنجی کے کھول دے۔ اس نے کہا بھائی میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ آہنگری کا دعویٰ نہیں کیا۔ ان کا مطلب اس نقل سے یہ تھا کہ ہم نے خدا کی طلب میں درویشی اختیار کی تھی یہ معلوم نہ تھا کہ عامل اور سیانا بھی بننا پڑے گا۔ یہی حال ہمارے ملک میں ان لوگوں کا ہے جو شاعری میں بدنام ہیں۔ وہ اور تو کسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے اور درحقیقت ہیں بھی نہیں البتہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی ان سے اس وقت متعلق ہو جاتی ہے جب کوئی مہتم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے۔ مثلاً کسی کے اصطبل کی مرمت ہوئی یا گھوڑا اختہ کیا گیا یا کسی کی مینا مرگئی یا مرغ پالی چیتا یا بلی نے بچے دیئے ایسے وقت میں شعرا کو مقابلہ کے امتحان کا موقع مل جاتا ہے۔ جو شخص مادۂ تاریخ فی الواقع یا صاحب فرمایش کے نزدیک سب سے اچھال نکال لاتا ہے اس کا فی الجملہ اعتبار بڑھ جاتا ہے۔ راقم چونکہ تاریخ نکالنے میں سدا سے پیٹا تھا اس لیے ہمیشہ اس امتحان سے کتراتا رہا۔ لیکن بری بھلی چند تاریخیں جو کبھی کبھی دوستوں یا بزرگوں کی فرمایش یا اپنے دل کی خواہش سے لکھی تھیں ان میں سے جس قدر سردست بہم پہنچیں دیوان میں شامل کر دی گئیں۔ تا کہ دیوان کے ضروری اخلاط میں سے ایک خلط کم نہ ہو جائے۔

تاریخِ وفات مرزا غالب مرحوم دہلوی

غالب نے جب کہ روضۂ رضواں کی راہ لی
ہر لب پہ آہ سرد تھی ہر دل میں درد تھا

اس دن کچھ اہلِ شہر کی افسردگی نہ پوچھ
دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا

حالی کہ جس کو دعویٰ تمکین و ضبط ہے
دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا

تھا گو وہ اک سخنورِ ہندوستاں نژاد
عرفی و انوری کا مگر ہم نبرد تھا

اس قافلہ میں آ کے ملا گو وہ سب کے بعد
اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا

ہم اور صبح و شام یہ اندوہِ جانگزا
دل تھا کہ فکرِ سال میں بے صرفہ گرد تھا

ناگاہ دی یہ غالبِ مرحوم نے صدا
(سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا)

"تاریخ" ہم نکال چکے پڑھ "بغیرِ فکر
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

تاریخِ وفات محمد ابراہیم جواں مرگ طالب علم بی اے کلاس دہلی کالج

محمد براہیم چوں ترکِ جاں گفت
زنخلِ جوانی ثمر برنخوردہ

بگفتم زرُوے الم سالِ فوتش
بجاں آفریں جانِ شیریں سپردہ

تاریخِ وفات سید خواجہ ناصر وزیرؔ مرحوم دہلوی

جب ہوئے ناصر وزیرؔ راہیِ ملکِ بقا
سب ہوئے اندوہ گیں شہر کے برنا و پیر

دل نے کہا ہر جگہ پھبتی ہے چیز اک جدا
باغ میں نسرین و گل، چرخ پہ مہرِ منیر

عیش میں شعر و غزل، سوگ میں تاریخِ مرگ
غیب سے آئی ندا "خلد میں ناصر وزیرؔ"

۱۲۹۳

تاریخِ طبعِ جغرافیۂ بے مثال مولفہ
خواجہ سید شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

وہ جغرافیہ جس کی تھی احتیاج
چھپا مژدہ اے طالبانِ کمال

نئی طرز کا ہے یہ جغرافیہ
عیاں جس سے ہے ربعِ مسکوں کا حال

ملی طرفہ تر اِس کی تاریخِ طبع
وہ خود طرفہ ہے جیسے بے قیل و قال

اگر سالِ ہجری کی ہے جستجو
تو جغرافیہ خود بتاتا ہے سال

ہو مطلوب تاریخ گر عیسوی
کہو اس کو جغرافیہ بے مثال

تاریخ بہ پایاں رسیدن بنائے سید مہر بالغلے مرحوم رئیس گلاوٹھی در شہر بلند

علی آں سیدِ والا کہ باشد
بنامش مہرباں جزوے زاجزا

بود با ذات او توأم سیادت
چناں کز نامِ او مہرست پیدا

چو ایں کاشانہ را بنیاد بنہاد
بعہدِ حاکم بیدار و دانا

گردوں آں فیض گستر کز وجودش
شد ایں معمورہ چوں گلشن سراپا

چنیں گفتمش حالی سالِ تعمیر
مکانِ بے نظیر آباد بادا

۱۲۹۹ھ

تاریخ اورنگ نشینی حضور آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علی خاں بہادر فرماں روائے ملک دکن

بہ سالِ فرّخ و ماہِ سعید و روزِ فرخندہ
نظام الملک محبوبِ علی خاں آصفِ ثانی

بہ تختِ سلطنت بنشت و حالی گفت تاریخش
برائے وے مبارک تاج و اورنگِ جہانبانی

تاریخِ تالیف قواعدِ اردو مولفہ خواجہ شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

قواعد ہے یہ اردو کی کہ جس کا
بیاں شافی ہے اور ترتیب محکم

کتابیں اس سے پہلے تھیں بہت سی
زیادہ حجم میں اور نفع میں کم

مگر یہ مختصر ہے اک رسالہ
کہ ہیں جس میں قواعد سب فراہم

وجود اس کا ہے گو سب سے مؤخر
پہ خوبی میں ہے اکثر سے مقدم

جو قیمت پوچھیے تو ہے بہت سہل
نہ دینار اس میں لگتے ہیں نہ درہم

اگر نام اس کا تاریخی ہو مطلوب
تو ہے اے طالبو "اکسیرِ اعظم"

۱۳۰۲ھ

تاریخ رحلت نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم دہلوی

دردا کہ ضیاء دین احمد بربست

رختِ سفر از جہاں کہ جائے الم ست

از طاق و ز ایوان و ز بزم و جلسا

۱۱۰ ۶۸ ۴۹ ۹۴

بکستہ بہ رحمتِ الٰہی پیوست

۲۰۹۴ (۱۳۰۲ھ)

تاریخِ طبع دیوانِ منشی اقبال حسین صاحب متخلص بہ عاشق

جواں مرد آزادہ عاشق کہ نیست

در اقران خود کس مرادورا قریں

نہ صیاد و ہموارہ از حسنِ خلق

پے صیدِ آزادگاں درکمیں

نہ سحّار و پیوستہ ز افسونِ نطق
کشد ز آشیاں بازو شیراز عریں

بے بارد از جبہہ اش انبساط
اگر مہرباں ست و گر خشمگیں

نہ جنبش گہِ سرکہ بر ابرواں
نہ یابیش افتادہ چیں بر جبیں

دو سال ست کاُ فسون مہرو وفاش
ربو دست صبرم ز جانِ حزیں

ولے دیر پیوند تا آشنا
کہ بودست فارغ زمہر و زکیں

ندانم کہ عاشق چہ افسوں دمید
کہ درباخت خود را بمہرش چنیں

سر رشتہ نیہات دادم ز دست
سخن ز آسماں بود و رفت از زمیں

کنوں رانم از طبعِ دیواں سخن
کہ شد جلوہ فرما بہ نوعے گزیں

دریں روزہا کز صروفِ زماں
سخن شد تہمان و سخنور مہیں

عروسِ سخن مے نیرزد بجو
بہ حسن ار بود غیرتِ حورِ عیں

صد آباد بر عاشق و عزمِ او
کہ در دورِ ناساز گاری چنیں

ز معنی بہ بیگانہ و آشنا
فشاندست گنجینہ از آستیں

چو دیوان اردوے عاشق کہ ہست
صنم خانۂ طرفہ گفتی زچیں

بہ پیرایۂ طبع آراستند
شنیدند از ہر کنار آفریں

سخن کش نبود از شے در جہاں
زشادی نہ گنجید در پوستیں

چو حالی ہے جست تاریخِ طبع
صنم خانۂ عاشق آمد سنیں

۱۳۰۷ھ

تاریخ بنائے چاہ درمحوطۂ مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ بحساب سالِ بعثتِ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم بحسنِ سعی جناب آنریبل سرسید احمد خاں بہادر

ہدایت کیجیے گر سالِ ہجرت کی محرم سے
تو کیجیے سالِ بعثت کا مہ شوال کو مبدا

کلام اللہ اترا آخرِ ماہ مبارک میں
ہوا اس واسطے شوال مبدا سالِ بعثت کا

نکالے یہ مبارک بن جناب سید احمد نے
بنایا جس نے دارالعلم میں یہ چشمۂ زیبا

زروئے سالِ بعثت چونکہ تھی تاریخ کی خواہش
کہا ہاتف نے حالی سے کہ ''چشمہ فیض احمد کا''

۱۳۰۱۲ نبوی

تاریخ طبع ترجمۂ تاریخ دربار قیصری بحساب سالِ عیسوی

پنجاب کے ادارۂ تعلیمِ عام نے
ایک اور کام ملک کے حق میں کیا ہے خوب

دربارِ قیصری کی جو تاریخ تھی چھپی
اب ترجمہ اسی کا مرتب ہوا ہے خوب

ہیں لفظ دل کشا تو مضامیں ہیں دل نشیں
ہے ترجمہ نفیس تو طرزِ ادا ہے خوب

چھپ کر ہوا تمام تو حالی نے یوں کہا
''دربارِ قیصری کا مرقع چھپا ہے خوب''

۱۸۸۲ء

تاریخ بنائے مہماں سرا در موضع مون
واقع پنجاب بحساب سالِ عیسوی

بحرِ کرم آں وزیر چند کہ باقی ست
نامِ بزرگانِ موں زبذل و نوالش

ساختہ منزل گہے چو بہرِ غریباں
تکیہ گہِ ہر غریب آمدہ سالش

۱۸۷۷ء

تاریخی جملے مقتبس از قرآن مجید

تاریخ وفات غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ مرحوم دہلوی رئیس جہانگیر آباد متخلص حسرتی وشیفتہ

جَزَاھُم بِمَا صَبَرُوْا جَنّٰتٍ وَّحَرِیْراً

۱۲۷۷ھ

آیۂ قرآنی میں بما صبروا جنۃ وحریراً ہے۔ چونکہ تاریخ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی تھی اس لیے جنۃ کی جگہ جنات کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ نواب آصف الدولہ کی مشہور تاریخ میں بجائے روح وریحان وجنۃ نعیم کے فھنا روح وریحان وجنات النعیم کردیا ہے۔

چونکہ نواب مرحوم نے مرض الموت میں مرض کے شدائد و آلام بے نظیر صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیے تھے۔ اس لیے اس آیت کا مضمون ان کی وفات کے نہایت مناسب تصور کیا گیا۔ یعنی جناب باری نے بعوض ان کے صبر کے بہشت اور بہشت کا لباس ان کو عنایت کیا۔

تاریخِ وفات نواب محمد نقشبند خاں مرحوم ولد اوسط نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس جہانگیر آباد

وَحُلُّوْا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّۃٍ

۱ ۲ ۹ ۴ ھ

چونکہ عزیز موصوف ایک وجیہ و شکیل آدمی تھے اور ان کی وفات عنفوان شباب میں واقع ہوئی تھی اس لیے یہ آیت ان کی تاریخ وفات کے لیے نہایت مناسب اور موزوں بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت کے ذکر میں ارشاد فرماتا ہے کہ "پہنائے گئے ان کو چاندی کے کنگن" بجائے مضارع کے ماضی کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ گویا ان کی مغفرت ہو چکی اور اہل جنت کے تمام حقوق ان کو مل چکے۔

یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں کی تاریخ وفات قرآن مجید سے برآمد ہوئی اور پھر ایک ہی سورت یعنی سورۂ دہر سے نکلی اور دونوں آیتیں اہل جنت ہی کے ذکر میں واقع ہوئی ہیں۔

تاریخ بنائے آئینہ خانہ درریاستگاہ بہاول پور

كَاَنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنَ الْقَوَارِيْرِ

۱۲۹۶ ہجری

قرآن مجید میں اصل آیت "انه صرح ممرد من قواریر" ہے۔ تاریخ میں بضرورت تکمیل اعداد اور نیز بمقتضائے مقام انه کی جگہ کانه کر دیا گیا ہے۔ مگر چونکہ اس سے بھی اعداد پورے نہیں ہوتے تھے اس لیے قواریر میں الف لام بڑھا کر القواریر کر دیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں جب سبا کی بادشاہزادی بلقیس اول ہی دفعہ وارد ہوئی تو اس کو شیش محل کے صحن پر جس میں آئینے لگے ہوئے تھے۔ یہ گمان ہوا کہ گویا پانی بھرا ہوا ہے۔ اس نے فوراً پائنچے چڑھا لیے۔ حضرت سلیمان نے کہا "انه صرح ممرد من قواریر" یعنی یہ تو ایک محل ہے جس میں شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ تاریخ میں انه کی جگہ کانه کر دینے سے یہ معنی ہو گئے کہ گویا یہ وہی سلیمان کا شیش محل ہے۔

یہ تاریخ ایک دوست کی فرمائش سے جو اس وقت بہاول پور میں ملازم تھے بھیجی گئی تھی۔ مگر ایسا سنا گیا تھا کہ پسند نہیں آئی۔ شاید اس لیے کہ اس میں دو جگہ اپنی طرف سے تصرف کیا گیا ہے یا اس لیے کہ نواب صاحب کا نام اس میں نہیں تھا۔

تاریخ وفات جناب مولانا قلندر علی زبیری پانی پتی غفراللہ
متخلص بہ عالمؔ

آن قلندر علی وحیدِ زماں
در نجابت زبیری و سندی

خاکِ پانی پت از سکونتِ او
در جہاں شد عَلَم بہ مستندی

مرد و باخویش بّرو حکمت و علم
ماند خلقے بہ کوے نابلدی

جز دلِ اُو کہ بُود جملہ صفا
نقد ہر کیہ جیّد ست وردی

جز کتابش کہ بد ہمہ حسنات
درجِ ہر نامہ نیکی ست و بدی

گفت سالِ وفات او مظہر
رفت عالم بہ جنتِ ابدی

۱۲۹۳ھ

تاریخِ وفات حافظ سعد اکبر مرحوم بانی مدرسۂ اسلامیہ پانی پت

چو سعد اکبر آں یاری گرِ قوم
کہ مر اہلِ وطن رابود یاور

سوے جنت زدنیا رخت بربست
ازیں غم تافت دلہا ہم چو آذر

دریغ آں نیک خواہِ جملہ احباب
دریغ آں غمگسارِ ہر برادر

دریغ آں درس گاہِ اہلِ اسلام
کہ ماند از مرگش بے برگ و بے بر

چنیں سالِ وفاتش یافت مظہر
شدہ جنت مقامِ سعدِ اکبر

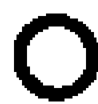
۱۳۰۰ھ

تاریخِ اورنگ نشینی حضور نواب آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علی خان بہادر دام اقبالہ فرمانروائے دکن

شاہِ دکن چوں نہاد حسبِ مرادِ عباد
افسرِ دولت بہ فرق پاے براورنگ داد

سالِ جلوسش خرد گفت کہ بے سرشدہ
فتنہ وفسق و فجور شرّ و فریب و فساد

۱۳۰۱ھ



عیاں شد چو عیدِ جلوسِ نظام
ہے خوشتر از عیدِ وصلِ حبیب

خرد فرق اعدا تراشیدہ گفت
کہ "نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتۡحٌ قَرِیۡب"

۱۳۰۱ھ

تاریخِ ولادتِ فرزندِار جمند درکاشانۂ اقبال حضورِ نظام دام اقبالہ

شد چو خورشیدِ شرف طالع بمشکوے نظام
قدسیاں گفتند شمع ملک و دولت آمدہ

مظہر اندر فکرِ تاریخِ ولادت رفتہ بود
عقل گفت "ایں لعل از کانِ شرافت آمدہ"

۱۳۰۱ھ

تاریخِ مدارالمہامی نواب میر لایق علی خان مرحوم در سرکارِ عالی

دوش کردم ز عقل چند سوال
کوست حلّال مشکلات و عُقَد

گفتمش کے بود کہ شاہِ دکن
بنشیند بہ مسندِ اَب و جَد

گفت جشنِ جلوسِ فرّخ او
در ہزار ست و سی صد ست واَحَد

گفتمش پس کہ باشدش دیواں
قرعہ بر لایق علی خاں زد

گفتمش سنگہا دریں راہ است
گفت زودا کہ حق بہ خواجہ رسد

گفتمش خواجہ کے شود دیواں
گفت "حق میرسد بمرکز خود"

۱۳۰۱ھ

تاریخِ بناومرمت مسجد مولانا حاجی ابراہیم حسین صاحب انصاری اثنا عشری پانی پتی دام ظلہم العالی

جعفری مذہبے بنا فرمود
بیتِ حق راکہ اعظم ست وقدیم

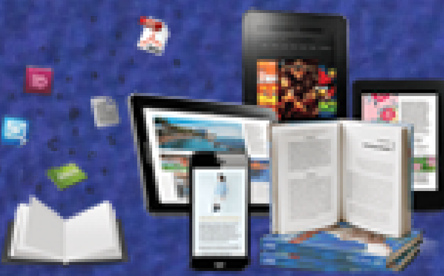
خبرش داد ملہمِ صادق
کرد تعمیرِ کعبہ ابراہیم

۱۳۰۰ھ

• بانی مسجد یعنی مولانا ابراہیم حسین صاحب کے والد کا نام اعظم علی اور ان کے چچا کا نام جعفر علی اور دادا کا نام صادق علی تھا۔ یہ تینوں نام اور خود بانی کا نام قطعہ تاریخ میں نہایت خوبی سے آیا ہے۔

[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	120/=
[illegible]	[illegible]	120/=
[illegible]	[illegible]	120/=
[illegible]	[illegible]	120/=
[illegible]	[illegible]	120/=
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	120/=
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]





خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار - لاہور ۷۲۱۲۱۶۹

